ماہنامہ

اِنذار

مدیر

ابو یحییٰ

مارچ 2018ء

دنیا کی کسی محرومی سے آپ
ہرگز پریشان نہ ہوں

دنیا کی ہر محرومی کا مطلب
آخرت کی عطا و بخشش ہے

www.inzaar.org

ماہنامہ

اِنذار

مارچ 2018ء جمادی الثانی/رجب 1439ھ

جلد 6 شمارہ 3

مدیر:
ابو یحییٰ ریحان احمد یوسفی

سرکولیشن مینیجر:
غازی عالمگیر

معاون مدیر:
عابد علی، بنت فاطمہ، سحر شاہ

معاونین:
محمد شفیق، محمود مرزا

ابو یحییٰ کے قلم سے

فی شمارہ ـــــ 25 روپے
سالانہ: کراچی (بذریعہ کوریئر) 500 روپے
بیرون کراچی (نارمل پوسٹ) 400 روپے
(زرتعاون بذریعہ منی آرڈر یا ڈرافٹ)
بیرون ملک 2500 روپے
(زرتعاون بذریعہ پوسٹل بیرئر آرڈر یا ڈرافٹ)
نارتھ امریکہ: فی شمارہ 2 ڈالر
سالانہ 24 ڈالر

P.O Box-7285, Karachi.
فون: 0332-3051201, 0345-8206011
ای میل: globalinzaar@gmail.com
web: www.inzaar.org

اغفرلی یارب......اغفرلی

مسجد میں عشاء کی نماز شروع ہوئی۔امام صاحب کے پرسوز حجازی لہجے نے نمازیوں کے دلوں ہی کو نہیں، مسجد کے در و دیوار کو بھی گرما دیا۔اسی اثنا میں ایک آواز اور بلند ہوئی اور پھر نماز کی چاروں رکعتوں میں بلند ہوتی رہی آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کوئی دس بارہ سال کا ابنارمل بچہ تھا۔ یہ اپنی طرف سے قرأت میں امام صاحب کا ساتھ دے رہا تھا، مگر درحقیقت اس کی آواز نے ہر نمازی کی توجہ منتشر کر دی تھی۔

نماز ختم ہوئی تو تمام نمازی غصے کے ساتھ اسی سمت دیکھنے لگے جہاں وہ بچہ تھا۔امام صاحب نے بھی لوگوں کو تنبیہ کی کہ ایسے مواقع نہ پیدا ہونے دیں۔ظاہر ہے کہ اس بچے نے پوری جماعت کو ڈسٹرب کر دیا تھا۔مگر مسجد میں صرف ایک شخص تھا جس کے لیے یہ ابنارمل آواز نماز سے توجہ ہٹانے کے بجائے خدا سے اور قریب کرنے کا سبب بن گئی تھی۔ یہ ہستی عارف کی ہستی تھی۔

جس لمحے بچے کی پہلی آواز آئی تھی وہ سمجھ گئے تھے کہ یہ کوئی ابنارمل بچہ ہے۔اس کے ساتھ ہی ان کا پورا وجود خدا کی مہربانیوں اور احسانات کے احساس سے زمین بوس ہو چکا تھا۔وہ شور جو دوسروں کو تکلیف دے رہا تھا، ان کے لیے اپنے مالک کی عنایات کا عجیب تجربہ بن گیا تھا۔ان کی ساری ہستی خدا کے سامنے سراپا شکر بن گئی۔ اگر خدا ان کو ابنارمل بنا دیتا تو؟ اگر خدا ان کی اولاد کو ابنارمل بنا دیتا تو؟ اس سوال کا جواب بس وہ آنسو تھے جو ان کی آنکھوں سے رواں تھے۔

نماز ختم ہوئی تو انھوں نے آسمان کی سمت دیکھ کر کہا۔ پروردگار! میں ہزار جان بھی تجھ پر نچھاور کروں تو تیرے احسانات کا بدلہ نہیں اتار سکتا۔میری ساری بندگی، تمام خدمت دین تیرے ایک احسان کا بدلہ بھی نہیں اتار سکتی۔میں پوری زندگی تیری حمد کے نغمے گا کر بھی ایک نعمت کا شکر ادا نہیں کر سکتا۔مجھے معاف کر دے۔اغفرلی یارب......اغفرلی۔

قرآنی حکم کی عام خلاف ورزی

قرآن مجید کے بعض احکام ایسے ہیں جن پر ننانوے فی صد لوگ عمل نہیں کرتے۔ مگر اس کے نتیجے میں معاشرتی زندگی میں بہت سے جھگڑے اور فساد پیدا ہوتے ہیں۔ اس کی ایک مثال طلاق دینے کا وہ طریقہ ہے جو قرآن مجید میں بیان ہوا ہے۔ ایسا ہی ایک اور حکم قرضے کے لین دین کے موقع پر دستاویز لکھنے اور اس پر گواہ مقرر کرنے کی قرآنی ہدایت ہے۔

سورہ بقرہ کی آیت 182 میں اللہ تعالیٰ نے انتہائی تاکید سے یہ قانون دیا ہے کہ جب قرض دیا جائے تو قرض لینے والے کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ قرض کا یہ معاملہ لکھ کر دو لوگوں کو اس پر گواہ بنا لے۔ اس حکم کی پیروی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مقروض قرض ادا کرنے کو اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے۔ وہ اگر قرض واپس نہیں کرے گا تو معاشرے میں بھی رسوا ہوگا اور عدالت میں بھی اس کو طلب کیا جا سکتا ہے۔

اس کے برعکس ہمارے ہاں قرضے کی کسی دستاویز کو لکھنے لکھانے پر توجہ دلائی جائے تو لوگ اس بات کا بہت برا مانتے ہیں۔ وہ اسے اپنے اوپر عدم اعتماد سے تعبیر کرتے اور گواہ مقرر کرنے کو اپنی بے عزتی سمجھتے ہیں۔ چنانچہ قرض خواہ بھی اسی میں عافیت سمجھتا ہے کہ وہ تعلقات کو نبھانے کے لیے اگر قرض دے رہا ہے تو یہ دستاویز بھی نہ لکھوائے۔

تاہم یہ بات جان لینا چاہیے کہ ایسا نہ کرنا ایک گناہ کبیرہ ہے۔ اس کے نتیجے میں چاہے مقروض قرض ادا بھی کر دے تب بھی فریقین اللہ تعالیٰ کے ایک حکم کی خلاف ورزی کر کے گناہ کے مرتکب ہو چکے ہیں۔ مزید یہ کہ اسی تساہل کے نتیجے میں بارہا مقروض قرض واپس نہیں کرتے یا کرتے ہیں تو وقت اور رقم میں اختلاف اور جھگڑا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں قرض کو محبت کی قینچی سمجھا جانے لگا ہے اور جسے اپنے تعلقات عزیز ہوتے ہیں وہ قرض دینے سے صاف انکار کر دیتے ہیں۔

آخرت کا یقین

ایمان اس یقین کا نام ہے کہ ہر انسان ایک روز دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔ رب کائنات ہر شخص سے زندگی کے ہر ہر قول و فعل کا حساب لے گا۔ پھر بدکاروں کا انجام جہنم ہوگا اور نیکوکاروں کی منزل جنت ٹھہرے گی۔ یہ ایمان اگر صرف مان لینے کا نام ہے تو ہر مسلمان اس کا قائل ہے۔ لیکن یہ اگر کسی ایسے یقین کا نام ہے جو زندگی کو بدل کر رکھ دے تو ایسے مسلمان ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے۔

قرآن اسی ایمان کی دعوت دیتا اور اسی یقین کو پیدا کرتا ہے۔ اس کا طریقہ بہت سادہ ہے۔ قرآن سمجھاتا ہے کہ جس منزل کی طرف وہ رہنمائی کررہا ہے، اس کا آدھے سے زیادہ راستہ تو انسان پہلے ہی طے کر چکے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ انسان عدم تھا، خدا نے اسے وجود بخشا۔ اس کا کون انکار کرسکتا ہے؟ اب بس اتنا سا کام باقی ہے کہ جو انسان عدم سے ایک دفعہ وجود میں آ چکا ہے، اسے بس دوبارہ زندہ ہی تو کرنا ہے۔

اس کی خوشخبری ہے کہ خدا کی جنت نیک لوگوں کا انعام ہوگی۔ وہ توجہ دلاتا ہے کہ دیکھو جنت تو خدا پہلے ہی اس جنتِ ارضی کی شکل میں بنا چکا ہے۔ اس وسیع و عریض کائنات میں جہاں ہوا ہے نہ پانی، غذا ہے نہ سبزہ وہاں ایک کرہ ارض پر ہوا، پانی، خوراک، زندگی، موسم؛ غرض زندگی کو وجود میں لانے اور برقرار رکھنے کے سارے اسباب اسی نے اکٹھے کردیے ہیں۔ یوں یہ جنت ارضی وجود میں آ گئی۔ جنت بس اس کی ایک اعلیٰ شکل ہوگی۔ اسے بنانا کیا مشکل ہے؟

وہ جہنم کی وعید کرتا ہے۔ اور اب تو ہر شخص جانتا ہے کہ سطح زمین کے تھوڑے سے رقبے کو چھوڑ کر اس کائنات میں ہر جگہ جہنم پہلے ہی سے موجود ہے۔ دہکتے ستارے، زمین کے اندر کا لاوا یہ جہنم نہیں تو اور کیا ہے۔

قرآن کا یہ طرز استدلال انسان کو سوچنے پر آمادہ کرتا ہے۔ یہی تفکر انسان میں آخرت کا یقین پیدا کرتا ہے۔ وہ آخرت جس کے آنے میں کوئی شک نہیں۔

کیا یہ آخری ''زینب'' ہے؟

قصور میں درندگی کا شکار ہوکر جان سے جانے والی سات سالہ معصوم زینب کا واقعہ کوئی پہلا واقعہ نہیں۔ اِسی قصور شہر میں صرف ایک برس میں پیش آنے والا یہ دسواں واقعہ ہے۔ جبکہ پورے پاکستان میں اس طرح کے واقعات مسلسل ایک تواتر کے ساتھ پیش آتے رہے ہیں جن میں معصوم بچے بچیوں کو حیوانیت کا نشانہ بنا کر قتل کر دیا جاتا ہے۔ صرف سن 2016ء کے اعداد وشمار کے مطابق سو بچے اس درندگی کا نشانہ بنا کر قتل کر دیے گئے تھے۔

اصل سوال یہ ہے کہ اس طرح کے کتنے سفاک مجرم پکڑے گئے اور کتنوں کو سزائے موت دی گئی؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اس طرح کے اکثر مجرم پکڑے نہیں جاتے، پکڑے جائیں تو ان کو سزا نہیں ملتی، سزا ملتی ہے تو اس پر عمل نہیں ہوتا۔ لوگوں سے ایسے واقعات کے متعلق پوچھا جائے تو دو چار واقعات سب ہی سنا دیں گے۔ لیکن یہ کوئی نہیں بتا سکے گا کہ ایسے کسی مجرم کو کبھی سزا دینے کا واقعہ میڈیا میں ایسے ہی رپورٹ ہوا ہو جیسے جرم رپورٹ ہوتا ہے۔

اگر صورتحال یہ ہے تو پھر دل تھام کر سنیے کہ یہ واقعہ آخری واقعہ نہیں ہے۔ جس معاشرے میں تربیت کے ادارے تباہ ہو چکے ہوں، فحش فلمیں ہر عام آدمی کی پہنچ میں ہوں، قانون صرف چیف جسٹس، سیاسی حکمرانوں اور آرمی چیف کی مداخلت کے بعد حرکت میں آتا ہو وہاں کوئی زینب آخری زینب نہیں ہوسکتی۔ اگر ہمیں اس صورتحال کو بدلنا ہے تو چند امور کے بارے میں پوری قوم کی سوچ کو بدلنا ہوگا۔

سردست ہماری قوم کا مسئلہ یہ ہے کہ یہ صرف کرنٹ افیئر ز میں جیتی ہے۔ سوشل اور الیکٹرونک میڈیا جس معاملے پر شور مچا دے گا، دو دن کے لیے سب اس میں لگ جاتے ہیں۔ پھر رات گئی بات گئی۔ دو دن بعد کوئی اور معاملہ اٹھے گا اور قوم کے دانشور اسی پر لکھ رہے ہوں گے اور

پوری قوم کو اسی کا غم کھائے جا رہا ہوگا۔

ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ اس طرح قوموں کی تعمیر ہوتی ہے اور نہ ان کے حقیقی مسائل اس طرح حل ہوتے ہیں۔ مثلاً اسی جنسی حیوانیت کے واقعے کو لے لیجیے۔ اس طرح کے مسائل کے حل کے مستقل مداوے کے لیے کچھ لوگوں کو ساری زندگی کچھ کاموں کے لیے لگانا ہوگی۔

کچھ لوگوں کو یہ طے کرنا ہوگا کہ وہ عدالتی نظام کو اوپر سے نیچے تک تبدیل کرانے کا عزم کریں گے۔ وہ ساری زندگی اسی جدوجہد میں لگا دیں گے کہ عدالتی نظام میں وہ تبدیلیاں لائی جائیں جن کے بعد کسی چیف جسٹس کی مداخلت کے بغیر ہی ہر مقدمے کا فیصلہ جلد از جلد ہونا ہمارے عدالتی نظام کی پہچان بن جائے۔ مجرموں کو سزا ملے اور بے گناہ باعزت بری ہو جائیں۔

کچھ لوگوں کو یہ طے کرنا ہوگا کہ پولیس کے نظام میں اصلاحات ان کی زندگی کا ہدف ہوں گی۔ وہ اس کے لیے ہر ممکن سیاسی اور سماجی دباؤ پیدا کر کے پولیس کے نظام کو کرپشن سے پاک کریں گے۔ سیاسی وابستگی اور رشوت کی بنیاد پر تقرر کے بجائے میرٹ پر پولیس کا نظام قائم کرنا ہوگا۔ تاکہ کوئی مجرم قانون کے شکنجے سے بھاگ سکے اور نہ کوئی بے گناہ اس کی زد میں آئے۔

کچھ لوگوں کو طے کرنا ہوگا کہ وہ معاشرے کی اخلاقی تربیت کو اپنا مسئلہ بنائیں گے۔ ان میں اعلیٰ اخلاقی اور انسانی اقدار کا ایسا شعور پیدا کریں گے کہ جرم وجود میں آنے سے قبل ہی مٹ جائے اور مجرم پیدا ہونے سے قبل ہی مر جائے۔

ظاہر ہے کہ ان میں سے ہر کام زندگی بھر کی جدوجہد چاہتا ہے۔ مگر آج بیس کروڑ کی آبادی میں سے بیس بیس لوگ بھی یہ عزم کر لیں تو بیس برس بعد اس طرح کے واقعات ختم نہ بھی ہوں تب بھی بہت کم ہو چکے ہوں گے۔ یہ نہ ہوا تو کرنٹ افیئر ز میں جینے والی قوم بیس برس بعد بھی کسی نہ کسی ''زینب'' کا ماتم کر رہی ہوگی۔

معاشرے کا اعتبار ختم نہ کیجیے

سوشل میڈیا کو سماج کا عکس کہا جاسکتا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا کے برعکس اس میں ابلاغ کا عمل عام آدمی کررہا ہوتا ہے۔ چاہے وہ فیس بک وغیرہ پر کوئی پوسٹ لکھے یا پھر لائک یا تبصرہ کے ذریعے سے اپنے خیالات کا اظہار کرے۔یہی معاملہ سوشل میڈیا کی دیگر سروسز ٹویٹر، وہاٹس ایپ، انسٹاگرام وغیرہ کا ہے۔

قصور سے تعلق رکھنے والی معصوم بچی زینب کے اندوہناک قتل کے بعد سوشل میڈیا اور خاص کر فیس بک پر سماج کا جو عکس نظر آیا ہے، اس کے بعض پہلو بہت مثبت ہیں، مگر بعض ایسے ہیں جن پر توجہ دلانا بہت ضروری ہے۔ان میں غالباً سب سے زیادہ اندوہناک پہلو معاشرے سے اعتباریت کے خاتمے کی لاشعوری کوشش ہے۔

جنسی زیادتی کے اس حادثے کے بعد لوگوں نے جس طرح اس موضوع کو زیر بحث بنایا اس سے گویا یہ نقشہ سامنے آیا کہ معاشرے کے ہر گھر میں بیٹیاں باپ سے، بہنیں بھائیوں سے، بھانجیاں اور بھتیجیاں اپنے ماموں اور چچا جیسے قریبی رشتوں تک سے غیر محفوظ ہیں۔بعض گھرانوں میں ایسے انسانیت سوز واقعات یقیناً پیش آئے ہوں گے، لیکن یہ بیس کروڑ کی آبادی میں انتہائی قلیل تعداد کا معاملہ ہے۔

اسی طرح ایسے واقعات کی عملی مثالیں پیش کرتے ہوئے یا پھر فحاشی کو اس طرح کی چیزوں کا ذمہ دار قرار دیتے ہوئے جو وڈیو اور تصویریں بے دھڑک عام کی گئیں، ان کی اکثریت اتنی مکروہ تھی کہ کوئی شریف النفس آدمی دیکھنا بھی گوارا نہ کرے۔اس طرح کی بے ہودہ چیزیں شیئر کرتے وقت ان سے کہیں زیادہ بے ہودہ یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ ''میں یہ تصویریں شیئر کرنے پر معذرت چاہتا ہوں مگر......''۔لوگوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ ایسی بے ہودگی پھیلانا اشاعت فاحشہ اور ایک گناہ کا کام

ہے، چاہے اس کی کوئی بھی وجہ پیش کی جائے۔

ہماری اس گفتگو کا مطلب یہ نہیں کہ غلطی کی نشان دہی نہ کی جائے یا صحیح رویے پر توجہ نہ دلائی جائے۔ مگر اصلاح کا کام توازن چاہتا ہے۔ عدم توازن سے کبھی خیر پیدا نہیں ہوتا، بلکہ شر پیدا ہوتا اور بڑھتا ہے۔ اس معاملے میں قرآن مجید ہمارا بہترین رہنما ہے۔

قرآن مجید تمام فواحش و منکرات کے سخت خلاف ہے۔ مگر ان کی اصلاح کے لیے وہ فواحش کی کوئی منظر کشی اور تفصیل نہیں کرتا۔ اس نے جو کچھ مذمت کی وہ بھی اجمال میں کی ہے اور اس ضمن میں جو ہدایات ہیں وہ بھی اجمالاً دی ہیں۔ اس کا اصل ہدف فرد پر باہر سے پہرے بٹھانے کے بجائے اندر سے اس کی سوچ کو بدلنا ہے۔ چنانچہ پورا قرآن اللہ تعالیٰ کے ہمہ وقت ساتھ ہونے، سمیع، بصیر، علیم اور خبیر ہونے کے تصور سے بھرا ہوا ہے۔ اسی طرح خدا کے حضور پیشی، ایک ایک عمل کے ریکارڈ کیے جانے اور ہر عمل کی جوابدہی کا تصور انسان میں وہ تقویٰ پیدا کرتا ہے جو انسان کو تنہائی میں بھی محتاط رہنے پر مجبور کرتا ہے۔

یہ قرآن مجید کے زیر تربیت وہ انسان ہیں جن کو مرد و زن کے اختلاط کے موقع پر کچھ آداب یہ کہہ کر سکھائے گئے ہیں کہ پاکیزگی کے جس راستے کے تم مسافر ہو اس میں صنف مخالف کے حوالے سے کوئی ناپاکی نہ پیدا ہونے پائے۔ چنانچہ پہلے مردوں کو سکھایا گیا کہ وہ صنف مخالف کی موجودگی میں اپنی نگاہوں کو آوارہ نہ ہونے دیں اور حفظ فروج (شرمگاہوں کی حفاظت) سے کام لیں۔ حفظ فروج قرآن کی ایک اصطلاح ہے جس کا مطلب اپنی جنسی جذبات پر ایسے قابو رکھنا ہے کہ انسان کا ظاہر اور اس کا باطن ننگے پن سے محفوظ رہے۔

مردوں کی تربیت کے بعد ٹھیک یہی بات عورتوں سے کہی گئی ہے۔ البتہ پھر ان کو یہ اضافی تلقین کی گئی ہے کہ دو چیزیں جو ان کی نسوانیت کا اظہار کرتی ہیں یعنی ان کا سینہ اور ان کی زینت؛

اس کو وہ ڈھانک کر رکھیں۔ زینتوں میں بھی یہ استثنا دے دیا گیا کہ قریبی محرم رشتہ داروں کے معاملے میں زینتیں ظاہر کی جاسکتی ہیں۔مگراس دائرے سے باہراصرار یہ ہے کہ پاؤں کی پازیب بھی یہ آواز بلند کرنے کی کوشش کرے کہ میں عورت ہوں تو حکم ہے کہ اس کی آواز بند کردو۔

یہ معمول کے حالات میں سورہ نور میں دیے گئے احکام کا خلاصہ ہے۔ جبکہ سورہ احزاب میں یہ بتایا گیا ہے کہ حالات اگر غیر معمولی ہیں اور اوباشوں نے شریف خواتین کو نشانہ بنالیا ہے تو پھر معاشرتی سطح پر اپنے تحفظ کے لیے ہر ممکن قدم اٹھایا جاسکتا ہے اور قانونی سطح پر بھی سخت ترین سزاؤں کا نفاذ کیا جاسکتا ہے۔ یہاں تک کہ ایسے مجرموں کو بری طرح قتل بھی کیا جاسکتا ہے۔

یہ اس حوالے سے قرآن مجید کے احکام کا پس منظر اوران کا خلاصہ ہے۔تاہم قرآن مجید نے کسی طور بھی معاشرے سے اعتباریت کو ختم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ نہ فواحش کے مسئلے کو لوگوں کے سر پر سوار ہونے دیا۔اس کا سارازور مادی اور حیوانی وجود کے بے لگام تقاضوں کو خدا کے قرب کے احساس اورانسان کی روحانیت بیدار کر کے ایک توازن میں رکھنے پر ہے۔

آج بھی کرنے کا یہی کام ہے۔ایک متوازن طریقے پر لوگوں کی حیوانیت کو روحانیت اور قرب خدا کے احساس کی لگامیں ڈالی جائیں۔نگاہ اور صنفی تقاضوں پر ضبط کے پہرے بٹھانے کی تلقین کی جائے۔خواتین کو اپنی نسوانیت کی بے محل نمائش پر متنبہ کیا جائے۔قوانین اور عدالتی نظام کو درست کیا جائے اور ایسے مجرموں کو عبرتناک سزا دی جائے۔لیکن معاشرے سے اعتباریت کا خاتمہ نہ کیا جائے۔ یہ تاثر نہ دیا جائے کہ ہر مرد ایک حیوان ہے جسے عورت نظر آجائے تو وہ انسانیت بھول کر ایک جانور کی طرح اس کے پیچھے لگ جاتا ہے۔

انسانیت اور رشتوں کی اعتباریت کسی معاشرے کا سب سے بڑا اثاثہ ہوتا ہے۔ ہمارے پاس یہ اثاثہ ابھی تک موجود ہے۔اسے لوگوں کے جذبات کے وقتی ابال کی نذر نہیں ہونا چاہیے۔

افراد کی برائی اور رویوں کی برائی

آج کل مولانا طارق جمیل صاحب کی ایک تصویر کے حوالے سے ان پر زبردست تنقید کا سلسلہ جاری ہے۔ دوسری طرف بہت سے لوگ ان کی حمایت میں بھی میدان میں آ گئے ہیں۔ ایسے میں کچھ اصولی باتیں قارئین کی خدمت میں پیش ہیں جو اس طرح کی تنقیدوں کو پرکھنے کے لیے انھیں درست زاویہ نظر فراہم کریں گی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ہر مسلمان کی جان، مال اور عزت دوسرے مسلمان پر حرام ہے، (مسلم، رقم 2564)۔ اس مفہوم کی متعدد روایات کتب احادیث میں پائی جاتی ہیں۔ اس طرح کی روایات کی روشنی میں کسی فرد کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی دوسرے مسلمان کی جان و مال کی طرح اس کی عزت کو کوئی نقصان پہنچائے۔

جو لوگ معاشرے میں اصلاح کے لیے کھڑے ہوتے اور تفقہ فی الدین رکھتے ہیں وہ اس بنیادی دینی حکم کی خلاف ورزی سے بچنے کے لیے دو چیزوں کا فرق اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ ان میں سے پہلی چیز کسی فرد کو بدنام کرنے کا عمل ہے اور دوسری چیز غلط رویے کی نشاندہی ہے۔

پہلی چیز یعنی کسی فرد کو بدنام کرنے کا عمل دنیا و آخرت دونوں کے لحاظ سے ایک غلط راستہ ہے۔ یہ عمل دین، اخلاق اور علم کے تمام مسلمہ اصولوں کو پامال کر کے کیا جاتا ہے۔ اس میں کسی متعین شخص یا خاص گروہ کا نام لے کر اس کو بدنام کرنے کی مہم چلائی جاتی ہے۔ اس مقصد کے لیے اس شخص یا گروہ میں وہ ساری برائیاں ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جو اس میں موجود ہی نہیں ہوتیں۔ اس کی ہر بات اور عمل کی بالکل غلط توجیہ کی جاتی ہے۔ قدم قدم پر جھوٹ، بدگمانی، بہتان وغیرہ سے کام لیا جاتا ہے۔ ہر صالح مزاج شخص یہ جان سکتا ہے کہ یہ کسی غلط رویے یا غلط نقطہ نظر پر تنقید نہیں بلکہ کسی کو بدنام کرنے کی مہم ہے۔ ایسی مہم بازی کا حق کسی شخص کو

حاصل نہیں ہے اور ایسا کرنے والا فعل حرام کا مرتکب ہوتا ہے۔ قیامت کے دن ایسے شخص کو سخت جوابدہی کے عمل سے گزرنا ہوگا۔

اس سے برعکس دوسری چیز غلط رویوں پر تنقید ہے۔ یہ کسی فرد کی تنقیص کا نہیں بلکہ غلط رویوں کی خرابی کی نشان دہی کا عمل ہوتا ہے۔ اس میں مسلمہ برائیوں کی نشاندہی کی جاتی ہے، مگر افراد کو ہدف نہیں بنایا جاتا۔ کسی فرد کا نام لے کر اس کو بدنام نہیں کیا جاتا۔ اس طرح کی تنقید میں سخت الفاظ بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ تشبیہات، استعارے اور کنائے جیسے موثر ادبی اسالیب سے چوٹ بھی کی جاتی ہے اور طنز و تعریض بھی ہوتا ہے۔ مگر یہ سب چیزیں اس لیے جائز ہوتی ہیں کہ اس میں کسی متعین فرد کا نام لیا جاتا ہے نہ کسی خاص شخص کو بدنام کرنے کی مہم چلائی جارہی ہوتی ہے۔ اصل نشانہ ایک برا رویہ ہوتا ہے جس کی شناعت پر لوگوں کو متنبہ کیا جارہا ہوتا ہے۔ اس کے پیچھے کوئی گروہی تعصب یا دشمنی، شہرت حاصل کرنے کا کوئی داعیہ اور دوسروں کو نیچا دکھانے کا کوئی جذبہ کارفرما نہیں ہوتا۔ پہلی چیز اگر سراسر شر ہے تو یہ دوسری چیز وہ خیر ہے جس سے معاشرے زندہ رہتے ہیں۔ اس کے کرنے والے اللہ کے ہاں اجر عظیم کے مستحق ہوتے ہیں۔

ان دو چیزوں کے علاوہ ایک اور چیز علمی تنقید ہوتی ہے۔ علمی تنقید کسی کے نقطہ نظر کی غلطی کو علمی دلائل سے واضح کرنے کا عمل ہے۔ اس میں تنقید کرتے ہوئے کبھی کسی فرد یا گروہ کا نام لینا پڑتا ہے۔ مگر اس میں بھی تمام مسلمہ اخلاقی اور علمی اصولوں کی پابندی کی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ اس بات کا امکان ہمیشہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ آخر کار تنقید کرنے والے کی بات ہی غلط ثابت ہوجائے اور جس پر تنقید کی جارہی ہے، اس کا نقطہ نظر بالکل درست ہو۔

اس کے برعکس جب تنقید میں ان علمی مسلمات کی خلاف ورزی کی جاتی ہے تو پھر یہ کوئی علمی تنقید نہیں ہوتی بلکہ دوسروں کو بدنام کرنے کا وہی عمل بن جاتا ہے جس کا شروع میں ذکر ہوا۔ ایسی

تنقید میں دوسرے کی بات غلط نقل کی جاتی ہے۔ بات کو سیاق وسباق سے کاٹ کر بیان کیا جاتا ہے۔ دوسرے کی طرف وہ بات منسوب کی جاتی ہے جو اس نے نہیں کہی ہوتی۔ دوراز کار توجیہات کی جاتی ہیں۔ ظن وگمان سے کام لیا جاتا ہے۔ نیت پر حملے کیے جاتے ہیں۔ کفر وایمان کے فیصلے دیے جاتے ہیں۔ یہ چیزیں مل کر اس تنقید کو ایک گناہِ کبیرہ بنا دیتی ہیں۔ ایسی تنقید کرنے والا روزِ قیامت خدا کے ہاں دوسروں کی عزت کو پامال کرنے کا مجرم قرار پائے گا۔

مسلمانوں کی تاریخ میں جو مصلحین اٹھتے ہیں وہ ان تمام چیزوں کا فرق ملحوظ رکھتے ہیں۔ وہ جب علمی تنقید کرتے ہیں تو صرف نقطہ نظر کی غلطی کو دلائل سے واضح کرنے تک خود کو محدود رکھتے ہیں۔ وہ کسی کی نیت کا فیصلہ کرتے ہیں نہ آخرت کا۔ ہمیشہ یہ امکان تسلیم کرتے ہیں کہ انھی کی بات غلط ثابت ہو جائے۔ وہ جانتے ہیں کہ وہ اس حد سے آگے بڑھیں گے تو بات علمی تنقید کی حد سے نکل کر کسی فرد کو بدنام کرنے اور اس کی عزت کو داغدار کرنے کی حدود میں داخل ہو جائے گی جو کہ ایک بہت بڑا گناہ ہے۔

ایسے مصلحین برے رویوں کی نشان دہی بھی کرتے ہیں۔ ایسا کرتے وقت بعض اوقات ان کا لب ولہجہ بہت سخت بھی ہو سکتا ہے۔ اس کی مثالیں انبیائے بنی اسرائیل کی تقاریر میں بھی دیکھی جا سکتی ہیں اور مسلمان مصلحین کے ہاں بھی اس کے متعدد نمونے ملتے ہیں۔ مگر ان کی یہ تنقید کسی دینی حکم کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان کی تنقید افراد کے خلاف نہیں بلکہ غلط رویوں پر ہوتی ہے۔ افراد پر تنقید اور رویوں پر تنقید دو بالکل جدا چیزیں ہیں جن کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔

ابو یحییٰ

اسلامی شریعت اور اسلام کی حقانیت

اس طالب علم کے فکری سفر کے ابتدائی کئی برس اسلام سے متعلق علمی مسائل کو سمجھتے اور فکری مباحث کو پڑھتے ہوئے گزرے ہیں۔اب بھی علمی مباحث سے دلچسپی ختم نہیں ہوئی۔ جب بھی کوئی ایسی علمی وفکری بحث سامنے آتی ہے جس میں کچھ سیکھنے کا امکان ہوتا ہے تو اسے دلچسپی کے ساتھ پڑھتا ہوں۔لیکن ماضی میں دوستوں کے اصرار کے باوجود بھی علمی مباحث پر نسبتاً بہت کم لکھا ہے اور اب تو ان امور پر اور بھی کم لکھتا ہوں۔

اس کا سبب یہ تو یقیناً نہیں کہ لکھ نہیں سکتا۔اس پہلو سے اس فقیر پر اللہ کی بڑی عنایت ہے۔ یہ بھی واضح کیا ہے کہ لاعلمی نہ لکھنے کا کوئی سبب نہیں۔اس کا سبب دراصل وہ زاویہ ہے جس سے قرآن مجید نے اس طالب علم کو روشناس کرایا ہے۔قرآن مجید اس بارے میں بالکل واضح ہے کہ اس دنیا میں اصل مسئلہ جو انسانیت کو درپیش ہے وہ روزِ قیامت اللہ کے حضور پیش ہونے کا ہے۔اُس روز رب کی بارگاہ میں وہی شخص سرخرو ہوگا جو اِس دنیا میں اپنے نفس کا تزکیہ کرنے کو اپنا مقصد اور ہدف بنائے رکھے گا۔

قرآن مجید نے اس نصب العین ہی کو دوٹوک الفاظ میں واضح نہیں کیا بلکہ عملاً وہ راستہ بھی بیان کیا ہے جس پر چل کر انسان اپنے علم وعمل کا تزکیہ کرسکتا ہے۔ یہ راستہ قرآن مجید کے الفاظ میں ایمان وعمل صالح کا راستہ ہے۔ایمان اپنے رب سے اس گہرے تعلق کا نام ہے جس کے بعد ہر چیز بشمول اپنی ذات، اپنے رشتہ دار، اپنی قوم اور اپنا گروہ؛ انسان کی نگاہ میں ثانوی ہوجاتا ہے۔ پھر انسان ہر تعصب، مفاد، خواہش اور اندیشے سے بلند ہوکر اپنی عبادت اور

اطاعت کو اپنے رب کے لیے خالص کر دیتا ہے۔

جبکہ عمل صالح خالق و خلق کے حوالے سے کیے گئے ان اچھے اعمال کا نام ہے جن کے نتیجے میں خیر ہی جنم لیتی ہے۔ قرآن مجید نے ان کی جو تفصیل کی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے ان کا جو نقشہ سامنے آتا ہے، وہ وہی ہے جسے عمومی طور پر اخلاق عالیہ کہتے ہیں۔

یہ دیکھنے میں ایک سرسری بات لگتی ہے مگر اس ایمان و اخلاق کے بغیر آخرت کی نجات کا تصور اپنے آپ کو دھوکا دینے کے سوا کچھ نہیں۔ ان چیزوں کی یہی وہ اہمیت ہے کہ ان کو چھوڑ کر اب کسی علمی اور فکری کام کے لیے قلم اٹھانا وقت کا زیاں محسوس ہوتا ہے۔ مگر بارہا ایسی چیزیں سامنے آجاتی ہیں جن پر بات کرنا خود ایمان کے پہلو سے ضروری ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی ایک اہم معاملے کو آج قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں کیونکہ اس بات کو نہ سمجھنے کی بنا پر بہت سے لوگ سنگین غلطیوں کا شکار ہوئے ہیں۔ بلکہ بہت سے لوگوں کا ایمان بھی اس وجہ سے متزلزل ہو گیا ہے۔ اس معاملے کا تعلق احکام شریعت کی ابدیت سے ہے۔

اسلامی شریعت اور اس کی اہمیت

اوپر جس ایمان و اخلاق کا ذکر ہوا اس کے علاوہ بھی ہمارے دین میں ایک تیسری چیز بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ تیسری چیز شریعت ہے۔ شریعت ان قوانین کا نام ہے جو ایمان و اخلاق کے تقاضوں کو ایک ایسی قابل عمل شکل میں سامنے لاتے ہیں جن کا تحمل ہر انسان کے لیے ممکن ہے۔ مثال کے طور پر ایمان کا تقاضہ ذکر کثیر یا اللہ کی بہت زیادہ یاد ہے۔ اللہ کا حق تو اتنا زیادہ ہے کہ ہر سانس کے ساتھ اس کی یاد آنی چاہیے۔ ظاہر ہے کہ اس بات کو نبھانا کسی کے لیے ممکن نہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے ذکر کثیر کی ایک کم سے کم شکل کو پنج وقتہ نماز کی شکل میں شریعت کے اس قالب میں ڈھال دیا جس کا اختیار کرنا ہر شخص کے لیے ممکن ہے۔

اس کی ایک اور مثال یہ ہے کہ بدکاری سے بچنا ایک اخلاقی مطالبہ ہے۔ لیکن انسانی معاشروں میں اس تقاضے کو نبھانا آسان نہیں۔ ایک طرف نفس انسانی اور اس کے تقاضے ہیں اور دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ انسانی معاشروں میں مرد و عورت کو الگ الگ دائروں میں بند نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ انسانی معاشرے مرد و زن کے باہمی تعلق ہی سے وجود پاتے اور ان کے باہمی تعامل ہی سے روزمرہ کے معاملات چلتے ہیں۔

چنانچہ ایک دفعہ پھر اخلاق کی اس مشکل کو شریعت نے آسان کیا۔ ایک طرف مرد و زن کو وہ احکام دیے گئے جن کی پابندی مرد و زن کے اختلاط کے موقع پر طرفین میں پاکیزگی پیدا کرتی ہے اور دوسری طرف اس مطالبے کو پامال کرنے والوں کے لیے سخت سزا مقرر کر کے معاشرتی سطح پر زنا کے رجحان کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے۔

چنانچہ یہ شریعت ہی ہے جو ایمان و اخلاق کے تقاضوں کو ایک قابل عمل ڈھانچہ فراہم کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ اسلام کی تعلیم کو فرد کی ذات سے آگے بڑھ کر معاشرے کے اجتماعی وجود پر اس طرح پھیلا دیتی ہے کہ دین ایک عملی تہذیب بن کر معاشرے کے رگ و پے میں سرائیت کر جاتا ہے۔

ان تمام پہلوؤں سے دیکھیے تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی یہ بات سمجھنا مشکل نہیں رہتی کہ انھوں نے کیوں شریعت کو تکمیل دین اور اتمام نعمت قرار دیا ہے۔ کیوں یہ خدا اور بندوں کے درمیان وہ مقدس عہد و میثاق ہے جس کی پابندی مسلمانوں پر فرض ہے۔ کیوں کہ اس کے مطابق فیصلہ نہ کرنے والوں کو قرآن مجید نے کافر، ظالم اور فاسق قرار دیا ہے۔

چنانچہ یہی وہ پس منظر ہے جس میں ایمان و اخلاق کی طرح شریعت بھی دین میں بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ اور وہ لوگ جو ایمان و اخلاق کے تقاضوں کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھالنا

چاہتے ہیں، ان پر یہ فرض ہے کہ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں شریعت کے قانون کی پابندی کریں۔

شریعت اوراس کا فہم

تاہم شریعت کا معاملہ ایک پہلو سے ایمان واخلاق سے جدا ہے۔ وہ یہ کہ ایمان واخلاق کی دعوت کو دین نے اتنا زیادہ اور اتنے گوناگوں پہلوؤں سے دہرایا ہے کہ اس کے فہم میں ٹھوکر کھانے کا عملاً کوئی امکان نہیں۔ گرچہ مشاہدہ ہے کہ لوگ پھر بھی ٹھوکر کھاتے ہیں، لیکن اصل بات اس قدر واضح ہے کہ تعصب سے بلند کسی بھی سلیم الفطرت شخص کے لیے درست بات سمجھنا زیادہ مشکل نہیں ہے۔

تاہم شریعت کا معاملہ یہ ہے کہ چونکہ یہ قانون ہے اس لیے ایمان واخلاق کی دعوت کے برعکس قرآن مجید نے اسے بار بار نہیں دہرایا بلکہ ایک ہی دفعہ بیان کردیا ہے۔ اس میں مزید مشکل یہ ہے کہ چونکہ پہلی دفعہ یہ قانون ایک ساتھ نہیں بلکہ حسب ضرورت اور حسب موقع جزوی طور پر نازل ہوا تھا اس لیے یہ قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں اجزا کی شکل میں بکھرا ہوا ہے۔ یعنی بات یوں نہیں ہے کہ شریعت اسلامی قانون کی کسی کتاب کی دفعات کے لحاظ سے قرآن مجید میں مرتب کی گئی ہے۔ اس پر مستزاد یہ حقیقت ہے کہ قرآن مجید اس قانون میں صرف اصولی ہدایات ہی بیان کرتا ہے۔ باقی وہ عرف و عادات کا لحاظ کرتے ہوئے بیشتر چیزیں معاشرے کے عرف پر چھوڑ دیتا ہے۔

ان تمام وجوہات کی بنا پر شریعت کی تفہیم کا کام گہرے تدبر کا متقاضی ہے۔ چنانچہ مختلف اہل علم جب اپنے اپنے پس منظر میں کھڑے ہوکر احکام شریعت کی تفصیل کرتے ہیں تو کچھ اختلافات رونما ہوجاتے ہیں۔ اسی پس منظر میں ہمارے ہاں مختلف فقہی مذاہب (مذاہب کے

لفظ سے عام قاری متوحش نہ ہوں۔ ہماری علمی روایت میں مذہب انھی معنوں میں استعمال ہوتا ہے جن میں آج کل مسالک اور مکاتب فکر کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں) وجود میں آئے۔ ایک زمانے میں فقہی اختلافات کی اہمیت اتنی زیادہ بڑھی کہ بات تفرقہ بازی تک جا پہنچی۔اور یہ اختلافات امت کو الگ الگ گروہوں میں بانٹنے کا سبب بن گئے۔گرچہ بڑے اہل علم کو یہ احساس ہمیشہ رہا کہ یہ فقہی اختلافات ایسے نہیں کہ ان کی بنیاد پر امت میں تفرقہ پیدا ہو، چنانچہ کچھ ان کے اثر سے اور کچھ حالات کے اثر سے اب اختلافات کی سنگینی عملاً کم ہوگئی ہے۔مگر دور حاضر میں شریعت کی اس فقہی تعبیر کے حوالے سے ایک دوسرا مسئلہ سامنے آیا ہے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے بہت سنگین تھا۔ یہ مسئلہ اگر حل نہ ہوتا تو دین اسلام کی حقانیت پر سنگین اعتراضات پیدا ہو سکتے تھے اور پیدا ہوئے بھی۔اس لیے اس مسئلے کو سمجھنا ضروری ہے۔

شریعت قدیم دور میں

اسلامی شریعت کو جب پہلی دفعہ ایک مکمل اور جامع فقہی قالب میں ڈھالا گیا تو وہ زرعی دور تھا۔زرعی دور کے اپنے تصورات اور اپنا نظام تھا۔اس دور کی اپنی فکر اور اپنا عرف تھا۔انسانی علم اور تمدن ایک خاص سطح پر تھا، معاشرے کا سیاسی، سماجی اور قانونی ڈھانچہ اور زندگی کے تمام معاملات اسی پس منظر میں چلتے تھے۔ چنانچہ اُس دور میں حکومتوں کا عزل ونصب ایک خاص طریقے پر ہوتا تھا۔آمدن کے ذرائع بڑے محدود اور زرعی پیداواری نظام کے پس منظر میں تھے۔ قانونی فیصلے اور عدالتیں ایک خاص طریقے پر کام کرتی تھیں۔

اس نظام اور اس عرف میں مثال کے دور پر سماج میں خواتین کا ایک خاص مقام اور دائرہ طے تھا۔غلامی عام تھی۔ گھر اور محل سرا لونڈی غلاموں سے بھرے تھے۔تنخواہ یافتہ طبقے کی جگہ یہی لوگ پورا معاشی اور سماجی ڈھانچہ سنبھالتے تھے۔سیاسی نظام میں تلوار واحد فیصلہ کن عامل تھی۔

قانونی نظام میں انسانی مشاہدے کے سوا کسی جرم کو ثابت کرنے کا کوئی حتمی ذریعہ نہ تھا۔ فنگر پرنٹ، ڈی این اے جیسی چیزوں سے کوئی واقف نہ تھا۔ غرض اس طرح کی درجنوں مثالیں دے کر یہ بتایا جاسکتا ہے کہ وہ ہر پہلو سے ایک مختلف سماج تھا۔

اللہ تعالیٰ ہمارے فقہا کو بہترین جزا عطا کرے کہ انھوں نے اپنے زمانے اور حالات کے لحاظ سے شریعت کی تفہیم کا عمل کیا اور اس کی بنیاد پر بلا شبہ ایک مکمل نظام زندگی بنایا جس سے ہماری فقہ وجود میں آئی۔ ہمارے قاضی اس قانون کے مطابق فیصلے کرتے تھے اور چونکہ اپنی ذات میں بہت دیانت دار لوگ ہوتے تھے اس لیے اپنے زمانے کے لحاظ سے یہ ایک انتہائی موثر نظام تھا۔

دور جدید کی تبدیلی

دور جدید میں دو بہت بڑی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ پہلی یہ کہ دنیا کی امامت مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئی۔ عملاً پوری مسلم دنیا پر مغرب کا سیاسی غلبہ قائم ہو گیا۔ ان کی حکومتیں ہی نہیں آئیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں ان کا نظام بھی آ گیا۔ اس میں جہاں اور تمام شعبہ ہائے زندگی متاثر ہوئے وہیں ہمارے قانونی نظام کی جگہ مغربی نظام اور ہماری عدالتوں کی جگہ ان کی عدالتیں قائم ہوگئیں۔

دوسری تبدیلی جو دراصل پہلی تبدیلی کی وجہ بنی تھی، یہ ہوئی کہ دنیا زرعی دور سے انڈسٹریل ایج اور پھر سپر انڈسٹریل ایج سے ہوتے ہوئے اب انفارمیشن ایج میں آ چکی ہے۔ یہ تبدیلی علم اور نظام ہی کی نہیں بلکہ فکر، تمدن، تصورات، عرف اور رواج ہر چیز کی ہمہ گیر تبدیلی تھی۔

تاہم انیسویں اور بیسویں صدی میں مسلم لیڈرشپ کے سامنے اصل مسئلہ سیاسی آزادی، مذہبی اور تہذیبی بقا کا تھا۔ چنانچہ ان کی توجہ دیگر امور کی طرف مبذول نہیں ہوئی۔ مگر جب سیاسی

آزادی کا وقت قریب آنے لگا تو مسلمانوں میں ایک عبقری شخص نے جو بلا شبہ اپنے زمانے میں جدید و قدیم اور مشرقی و مغربی علوم کا جامع ،مفکر، سیاستدان، قانون دان اور مذہب سے گہری محبت رکھنے والا اور اس کی سمجھ رکھنے والا شخص تھا، اس نے آنے والے مسئلے کا ادراک کرلیا۔ یہ شخصیت علامہ اقبال کی تھی اور مسئلہ یہ تھا کہ عنقریب مسلمانوں کی ریاست قائم ہونے جا رہی تھی جہاں اگر شریعت کے نام پر وہی قدیم فقہی روایت نافذ کر دی جاتی تو اقبال کی دوررس بصیرت نے یہ دیکھ لیا تھا کہ یہ فقہی روایت عصر حاضر میں بڑی حد تک غیر موثر ہو جاتی اور نتیجے کے طور پر جدید نسل کی اسلام سے بدگمانی کا سبب بن جاتی۔

بعض مثالیں

ہم نے یہ بات لکھ دی ہے تو آگے بڑھنے سے قبل یہ ضروری ہے کہ ایک دو مثالوں سے بتایا جائے کہ وہ کیا مسئلہ ہے جسے اقبال کی دوررس نگاہوں نے بہت پہلے دیکھ لیا تھا اور جس کی سنگینی پر مولانا علی میاں نے 1977ء میں پاکستان کے دورے کے دوران اہل علم سے خطاب کرتے ہوئے توجہ دلائی تھی۔ یعنی شریعت کا نفاذ کمان کا واحد تیر ہے۔ یہ اگر نشانے سے خطا ہو گیا تو دوسری دفعہ یہ تیر استعمال نہیں ہوسکتا۔ ان کا مدعا یہ تھا کہ شریعت کے عملی نفاذ سے قبل اہل علم لوگوں کو یہ یقین دلاتے رہے تھے کہ یہ ہمارے سارے مسائل کا حل ہے۔ شریعت نافذ ہوگئی اور مطلوبہ نتائج نہ نکلے تو لوگوں کا اسلام پر سے اعتماد ہی اٹھ جائے گا۔ بدقسمتی سے مولانا علی میاں کی بات درست ثابت ہوئی۔ پاکستان میں دنیا نے سن اسی اور نوے کی دہائی میں اسلام نافذ ہوتے ہوئے دیکھا اور یہ بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اس کے بعد ہمارا معاشرہ بہتری کی طرف گامزن ہوا یا بد سے بدتر ہوتا چلا گیا۔ اور اب ہمیں الحاد اور اس سے کہیں بڑھ کر اس سیکولر اپروچ کا سامنا ہے جو ریاست کی سطح پر مذہب کی ہر مداخلت کے خلاف ہے اور یہ سوچ ہر گزرتے دن کے

ساتھ طاقتور ہوتی چلی جا رہی ہے۔

اس حوالے سے جو سب سے بڑا عملی مسئلہ سامنے آیا، وہ حدود کے نفاذ کا تھا۔ حدود کے قانون میں بنیادی مسئلہ یہ سامنے آیا کہ قتل، چوری اور زنا جیسے سنگین جرائم میں خواتین کی گواہی قابل قبول ہی نہیں۔ یعنی معاملہ یہ نہیں کہ عورتوں کی گواہی آدھی ہے بلکہ ان جرائم میں حدود کی سزا نافذ کرنے کے لیے سرے سے خواتین کی گواہی ہی قابل قبول نہیں۔ اب کوئی شخص کتنی ہی تقریر کر لے اور جو منطق چاہے پیش کر دے (اور ایک زمانے میں ہم نے بھی لوگوں کو خاموش کروانے کے لیے یہ کام بہت کیے ہیں) یہ قانون کسی جدید معاشرے میں قابل عمل نہیں رہ پاتا۔ مزید یہ کہ قابل عمل ہونا تو الگ بات ہے یہ قانون اگر واقعی خدائی قانون ہے تو ایک جدید انسان کے ذہن میں خود اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات عالیہ کے بارے میں سنگین سوالات پیدا کر دیتا ہے۔

دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ قرآن مجید قتل، چوری اور فساد فی الارض کی سزائیں بیان کرتا ہے، مگر ایسی کسی شرط کے بیان سے مکمل طور پر خالی ہے۔ احادیث کا پورا ذخیرہ بھی ایسی کسی بات سے خالی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کے بعد دفاع کس چیز کا کیا جائے اور کیوں کیا جائے؟ مگر ہم بھی ایک زمانے تک اسی کا دفاع کرتے رہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مقلدانہ ذہن کے تحت انسان جب کوئی نقطہ نظر قائم کر لیتا ہے تو آدمی اگر ذہین ہے تو ادھر ادھر سے کچھ چیزیں جمع کر لیتا ہے اور منطق اور نکتہ آفرینی کے ذریعے سے ایک عام آدمی کو خاموش کر سکتا ہے، مگر ایسے تمام افکار کو آخر کار زمانے کے سامنے سپر ڈالنا پڑتی ہے۔

بہر حال مسئلے کی سنگینی یہ ہے کہ ہم جو چاہے کہہ لیں، اس خاتون کا کیا کیا جائے جس کے باپ بھائی کو اس کے سامنے مار دیا جائے اور جب وہ قاتل کی نشان دہی کرنے جائے تو اسے بتایا

جائے کہ خدا کے قانون میں تمھاری گواہی مقبول نہیں۔ اس پر ایک زمانے میں ہم بھی کہتے تھے اور آج لوگوں کو کہتے ہوئے سنتے ہیں کہ عدالت قاتل کو تعزیراً سزا دے گی۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا قاضی اللہ تعالیٰ سے زیادہ عاقل، باضمیر، دردمند اور صاحب علم ہے کہ جس کو خدا نے اپنے قانون کے تحت سزا نہیں دی، وہ سزا دے گا۔ اصولی بات ہے کہ خدا کے قانون کے تحت جس کا جرم ثابت ہو جائے، اس پر حد نافذ کی جائے اور جس کا جرم ثابت نہ ہوا سے بری کر دیا جائے۔ یہ دعویٰ ناقابل فہم ہے کہ جرم خدا کے قانون کے تحت تو ثابت نہیں ہوتا، ہاں انسان کے بنائے ہوئے قانون کے تحت ثابت ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ملزم خدا کے قانون کے تحت بری ہو چکا ہے تو ہم اپنے قانون کے تحت اس کا جرم ثابت کر کے اسے سزا دیں گے۔ ایسا کوئی تصور عقل عام اور قانون دونوں کے خلاف ہے۔

اقبال کا حل

بہر حال اقبال کے سامنے یہ مسئلہ بہت پہلے آ چکا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی کتاب

The Reconstruction of Religious Thought in Islam

جس کا ترجمہ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کے نام سے ہوا، اس کے چھٹے خطبے:

The Principle of Movement in the Structure of Islam

میں اقبال نے یہ ساری بحث کی ہے۔ انھوں نے فقہ اسلامی کے ماخذوں یعنی قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس پر بحث کرتے ہوئے اپنا یہ نقطہ نظر پیش کیا ہے کہ اجماع کو بذریعہ پارلیمنٹ (ایک ایسی پارلیمنٹ، علما بھی جس کا حصہ ہوں) کو استعمال کرتے ہوئے اجتہاد کیا جائے اور پرانے قوانین کے بجائے عصر حاضر کے لحاظ سے نئے قوانین کو نافذ کیا جائے۔

اس معاملے میں اقبال اس حد تک گئے ہیں کہ حدود کے قوانین یا اسلامی سزاؤں کو بھی

عربوں کے حالات کے لحاظ سے انھی کے لیے خاص سمجھتے ہیں۔ مگر اقبال کے حل میں رکاوٹ قرآن مجید کی وہ آیات ہیں جن کے مطابق اگر اللہ کے نازل کیے ہوئے قانون کے تحت فیصلے نہیں کیے جاتے تو ایسے لوگ کافر، ظالم اور فاسق ہیں۔ سوال یہ ہے کہ قرآن مجید کے اتنے سخت بیان کی بنا پر جو حدود کے قوانین ہی کے پس منظر میں نازل ہوئے، اسلامی سزاؤں کو کیسے معطل کیا جا سکتا ہے؟

غالباً اقبال ہی کے اس نقطہ نظر سے متاثر ہو کر بعد میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے شریعت کی تاریخی حیثیت کا تصور دیا جسے نہ صرف ہمارے ہاں کئی بڑے اہل علم قبول کرتے ہیں بلکہ دیگر مسلم ممالک کے اہل علم کے ہاں بھی یہ نقطہ نظر بہت مقبول ہو چکا ہے۔ اس تصور کی اساس یہ تصور ہے کہ شریعت اپنی نوعیت کے لحاظ ہی سے عربوں یا معاصر زمانہ کے لیے تھی۔ بعد کے لوگ یا دیگر اقوام مقاصد شریعت کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے لحاظ سے مختلف قوانین بنا سکتے ہیں۔ ان قوانین کا مقصد وہی ہوگا جو شریعت کے پیش نظر تھا لیکن وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے معاصر زمانہ اور اس خاص قوم کے حالات کے لحاظ سے مدون کیے جائیں گے۔ مثلاً قطع ید (ہاتھ کاٹنے) کی سزا کا اصل مقصد چوری کی حوصلہ شکنی تھا تو آج بھی کوئی ایسا ہی قانون بنا لیا جائے گا جو چوری کی حوصلہ شکنی کرے، مگر ہاتھ کاٹنے کے بجائے کوئی ایسی سزا دی جائے گی جو معاصر زمانہ کے حالات اور ذہنی تصورات کے لحاظ سے ہو۔

یہ تصورات آخر کار معاملات کو سینٹ پال کے نظریہ تخصیص و ترک شریعت (یعنی شریعت موسیٰ صرف یہود کے لیے ہے اور باقی اقوام کے لیے ان کی پابندی ضروری نہیں) کے قریب ہی لے جانے والے ہیں۔ اس فکر کے ایک شارح عالم دین سے ایک دفعہ اس طالب علم نے دریافت کیا کہ کیا عبادات میں بھی اسی اصول پر عمل کیا جائے گا۔ انھوں نے نفی میں جواب دیا تو

اس طالب علم نے پوچھا کہ کس اصول پر عبادات اس ضابطے سے بری قرار پائیں گی؟ کیونکہ جو اصول حدود میں درست ہے وہ مثال کے طور فجر کی نماز میں کیسے غلط ہوسکتا ہے۔ دور جدید کے تمدن میں فجر کی نماز قابل عمل نہیں رہی ہے۔سوال یہ ہے کہ اس کا وقت کیوں آگے نہیں کیا جائے گا؟ یا نماز ہی کو مکمل طور پر ترک کر کے اس کے اصل مقصود یعنی یاد الٰہی کو کسی مراقبے یا ذکر سے حاصل کرلیا جائے۔ اس میں کیا حرج ہے؟ اس سوال کا کوئی جواب نہیں مل سکا۔

بہر حال یہاں بھی قرآن مجید ہی راستے میں آجاتا ہے اور صاف بتاتا ہے کہ اللہ کے نازل کیے ہوئے قانون کے مطابق جو لوگ فیصلہ نہ کریں وہ اللہ کی نظر میں کافر، ظالم اور فاسق ہیں۔

مسئلے کا حل

یہ عملاً وہ صورتحال ہے جس سے اب تمام مسلم دنیا عملاً دوچار ہو چکی ہے۔ باقی دنیا کے برعکس جو پہلے ہی صنعتی دور کے سماج میں جا چکی تھی، مسلم سماج بیسویں صدی تک قبائلی زرعی دور میں موجود تھا۔ مگر انفارمیشن ایج کے آغاز کے بعد تمام انسانی سماج اب تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ زرعی دور میں رائج بیشتر سماجی اور تمدنی تصورات اب تبدیل ہو چکے ہیں۔ بیسویں صدی میں جو بات اقبال جیسے عبقری کے سامنے آ گئی تھی وہ اکیسویں صدی کے ہر مرد و عورت پر واضح ہوتی چلی جا رہی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اگر اقبال کا حل بھی قابل قبول نہیں تو مسئلے کا حل کیا ہے؟

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کے جس زندہ و جاوید تصور سے بھرا ہوا ہے وہ اس ہستی کا نام ہے جو ہر طرح کے حالات سے باخبر اور ہر چیز سے اس کے ظہور سے قبل ہی واقف ہو جانے والی ہستی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس صورتحال کو اس کے ظہور سے قبل ہی جان لیا تھا۔ اور اس بات کا پورا بندوبست کر دیا تھا کہ جس وقت اصل مسئلہ پوری طرح اٹھے گا، مسئلے کا حل سامنے آ جائے گا۔

عالم اسباب میں اس کی شکل یہ ہے کہ برصغیر کے ایک جلیل القدر عالم امام حمید الدین فراہی

نے بیسویں صدی کے آغاز میں قرآن مجید کے فہم وتدبر کے وہ اصول واضح کیے جن کی مدد سے قرآن مجید کی دعوت، اسلوب، اور استدلال کو بالکل واضح طور پر کھول دیا گیا۔ ان کے جلیل القدر تلمیذ امین احسن اصلاحی نے اپنی تفسیر تدبر قرآن کو انھی اصولوں پر مرتب کیا اور ان کے تلمیذ رشید جاوید احمد صاحب غامدی نے ان اصولوں کی بنیاد پر پورے دین اور خاص کر شریعت اسلامی پر اپنی کتاب میزان میں وہ کام کر دیا ہے جس کے بعد وہ سارے اشکالات دور ہو گئے جو دور جدید میں پیدا ہوئے تھے۔ تفصیل کے طالب ''میزان'' کو دیکھ سکتے ہیں، خلاصہ ہم ذیل میں کر دیتے ہیں۔

۱) خدا کی شریعت ایک مقدس چیز ہے جس کا کوئی حکم تبدیل نہیں ہو سکتا۔

۲) اہل علم کسی بھی دور کے ہوں ان کی کوئی رائے شریعت نہیں بن جاتی بلکہ ان کا فہم ہی رہتی ہے۔ یہ اصل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہستی ہے جو دین اور شریعت کا تنہا ماخذ ہے۔

۳) شریعت کی رو سے قتل و جراحت، زنا، قذف، چوری اور فساد فی الارض (یعنی لوگوں کی جان، مال اور آبرو کو اس طرح نقصان پہنچایا جائے کہ قتل دہشت گردی کا، چوری ڈاکے کا اور زنا عصمت دری کا روپ دھار لے) جیسے جرائم کی سزائیں اللہ تعالیٰ نے خود مقرر کی ہیں اور قیامت تک کے لیے ان میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

۴) تاہم یہ سزائیں مثلاً چور کی سزا اس کا ہاتھ کاٹنا جرم کی انتہائی سزا ہے۔ یعنی جب جرم اپنی نوعیت اور مجرم اپنے حالات کے لحاظ سے کسی رعایت کا مستحق نہ ہو تب اسے یہ سزا سنائی جائے گی۔ چنانچہ اسی پس منظر میں قرآن نے خود ان لونڈیوں کے لیے زنا کی سزا نصف کر دی جو خاندان، تحفظ اور تربیت کے بغیر زندگی گزار رہی تھیں۔

۵) ان جرائم کے ثبوت میں زنا کے علاوہ کسی اور جرم کے لیے گواہی کا کوئی ضابطہ مقرر نہیں کیا گیا

ہے۔ زنا چونکہ سماج کے خلاف کیا گیا ایک جرم ہے، اس لیے سماج کی نمائندگی کرتے ہوئے چار افراد کو اس جرم کے خلاف کھڑے ہو کر گواہی دینا چاہیے۔ باقی جرائم کے ثبوت میں کوئی پابندی نہیں۔ بلکہ جس طرح اور جس بنیاد پر عدالت مطمئن ہو جائے جرم ثابت ہو جائے گا۔

آخری بات

ان میں سے ہر بات قرآن مجید کی تعلیمات پر مبنی ہے اور ان تمام معقول اعتراضات سے پاک ہے جو ذہنوں میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اس میں گواہی کا کوئی ضابطہ طے نہیں کیا گیا ہے سوائے زنا کے جس میں گواہوں کا نصاب اللہ تعالیٰ نے خود طے کر دیا ہے۔ اسی طرح اس میں یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ اسلامی سزائیں گرچہ بہت سخت ہیں، مگر یہ ہر مجرم کو نہیں سنائی جائیں گی بلکہ وہ مجرم جو کسی پہلو سے رعایت کا مستحق نہ ہو اسی کو سنائی جائیں گی۔

ہم نے شریعت کے اس موضوع پر اس قدر درازنفسی اس لیے کی ہے کہ دور جدید میں اسلام اپنے مرحلہ دعوت میں لوٹ چکا ہے۔ اب غیر مسلموں ہی کو نہیں، خود مسلمانوں کو بھی سمجھانا پڑتا ہے کہ اسلام کی تعلیم کا ہر پہلو عقل و فطرت کے مطابق ہے۔ یہ قرآن مجید کا معجزہ ہی ہے کہ اس کی جو بات چودہ سو برس قبل کے زرعی اور قبائلی معاشرے میں قابل عمل تھی، وہ آج کی انفارمیشن ایج میں بھی اسی طرح قابل عمل ہے۔ یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ قرآن کسی انسان کی تصنیف نہیں جو اپنے حالات سے متاثر ہو کر آراء قائم کرتا ہے بلکہ اس پروردگار عالم کا کلام ہے جو ہر شے کا علم رکھتا ہے۔ اس پہلو سے اصل اسلامی تعلیم اس کی حقانیت کا ایک ثبوت ہے۔

جہاں رہیے اللہ کے بندوں کے لیے باعث زحمت نہیں، باعث رحمت بن کر رہیے۔

سوال و جواب

ابو یحییٰ

توکل اور رزق

سوال: السلام علیکم سر۔ سورہ طلاق کی ابتدائی آیات میں ہے کہ تقویٰ اور توکل کرنیوالوں کو اللہ وہاں سے رزق دیتا ہے جہاں انسان کا گمان بھی نہیں سوال یہ ہے کہ اس رزق کی حقیقت کیا ہے اور یہ رزق خصوصاً طلاق کے معاملے میں ملتا ہے یا عمومی طور پر بھی؟

شفقت علی (رینالہ خورد)

جواب: محترم شفقت علی صاحب!

السلام علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہ،

سورہ طلاق میں جو بات زیر بحث ہے وہ یہ ہے کہ ایک شخص جس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے اسے چاہیے کہ وہ عدت پورا ہونے کے عرصے تک جو تقریباً تین ماہ کا ہوتا ہے، اس میں اپنی اس بیوی کو گھر رکھ کر اس کے اخراجات دے جسے وہ عملاً چھوڑ چکا ہے اور جس پر مال خرچ کرنے کی کوئی وجہ بظاہر اس کے پاس نہیں۔ اور تین ماہ بعد جب وہ اسے رخصت کرے تو بھلے طریقے سے دے دلا کر رخصت کرے۔

ظاہر ہے کہ یہ ایک بہت مشکل کام ہے۔ ایسے میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو یہ حوصلہ دیا ہے کہ جو لوگ خدا خوفی اختیار کر کے صرف اللہ کے لیے اس حکم کو مانیں گے اور اسی پر بھروسہ کریں گے اللہ تعالیٰ ان کو اس احسان کے بدلے میں وہاں سے رزق دے گا جہاں سے ان کا گمان بھی نہ ہوگا۔ چنانچہ اس روشنی میں آپ کے پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ یہاں رزق سے مراد مادی رزق ہے۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر اس موقع پر انفاق کی اسپرٹ واضح ہے یعنی ناپسندیدہ جگہ پر صرف اللہ کی رضا کے لیے خرچ کرنا جو کہ احسان کا بہت اونچا مقام ہے، کوئی شخص اگر یہ مشکل گھاٹی چڑھنے کی ہمت کر لے تو بلاشبہ دیگر مواقع پر بھی وہ اللہ کی مدد و نصرت کو اپنے شامل حال دیکھے گا اور انشاءاللہ؛ اللہ تعالیٰ اس کے رزق میں برکت عطا فرمائیں گے۔

دعا گو

ابو یحییٰ

نبیوں کے انتخاب کا معیار

سوال: السلام علیکم

مبشر علی زیدی صاحب لکھتے ہیں:

خدا کے منتخب بندوں یعنی انبیا کے ایوان میں کوئی عورت شامل نہیں، کوئی خواجہ سرا شامل نہیں، کوئی معذور شامل نہیں، کوئی غلام شامل نہیں، کوئی سیاہ فام شامل نہیں، کوئی نچلی ذات سے تعلق رکھنے والا شامل نہیں۔ کیا خدا ایکوئل اپرچونٹی ایمپلائر نہیں۔ کیا اس کے ادارے میں مساوات کی بنیاد پر انتخاب نہیں کیا جاتا؟ پھر بندگان خدا اپنے ایوانوں میں عورتوں کو کیوں شامل کریں؟ خواجہ سراؤں کو کیوں شامل کریں؟ معذوروں کو کیوں شامل کریں؟ مزدوروں کو کیوں شامل کریں؟ نسلی اقلیتوں کو کیوں شامل کریں؟ شودروں، دلتوں اور اچھوتوں کو کیوں شامل کریں؟ کیا خدا ہے؟ اگر ہے تو کیا وہ متعصب ہے؟ نسل پرست ہے؟ سرمایہ پرست ہے؟ وڈیرہ پرست ہے؟ ممکن ہے کہ خدا فیمنسٹ ہو، ایکوئل اپرچونٹی ایمپلائر ہو، سیکولر ہو، سوشلسٹ ہو۔ ممکن ہے کہ خدا کو بندگان خدا نے غلط سمجھا ہو۔

آپ کی رائے درکار ہے؟

سید حسین علی شاہ

جواب:

محترم سید حسین علی شاہ صاحب

السلام علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہ،

نبوت کا ادارہ ایک خاص مقصد کے لیے وجود میں لایا گیا تھا۔ وہ مقصد یہ تھا کہ خدا کا پیغام خدا کے بندوں تک بے کم وکاست پہنچ جائے۔ یہ پیغام عام طور پر لوگوں کی مرضی اور خواہش کے مطابق نہیں ہوتا تھا اور وہ اسے سننا ہی نہیں چاہتے تھے۔ اب اللہ تعالیٰ کو اس کار عظیم کے لیے انسانوں ہی میں سے افراد کا انتخاب کرنا تھا۔ دوسری طرف عام انسانوں کا مسئلہ یہ ہے کہ انھوں نے جو دنیا بنائی اس میں ان طبقات کو ہمیشہ کمزور سمجھا گیا ہے جن کا سوال میں ذکر ہے۔ چنانچہ اس پس منظر میں یہ ضروری تھا کہ نبی اس شخص کو بنایا جائے جس کے مقام اور حیثیت کی بنا پر لوگ کم از کم اس کی بات سننے پر تو آمادہ ہو جائیں۔ اگر یہ منصب کسی کمزور طبقے کے فرد کو دیا جاتا تو کوئی اس کی بات ہی نہیں سنتا۔ جس کے نتیجے میں وہ اس مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو پاتا جس کے لیے نبوت کا ادارہ بنایا گیا تھا۔

اس کو مثال سے یوں سمجھیں کہ فوجیوں کو جنگوں میں حصہ لینا ہوتا ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے فوج کے ادارے میں جسمانی طور پر بہترین فٹنس کے لوگوں کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ اب ایک شخص یہ اعتراض کرے کہ فوج میں معذوروں کو نہ لینا عدل کے خلاف یا معذوری کے خلاف امتیازی سلوک ہے تو یہ اعتراض درست نہیں ہوگا۔ فوج کا میرٹ اور عدل ہی یہ ہے کہ وہاں جسمانی طور پر فٹ لوگ لیے جائیں۔ اس سے ہٹ کر کچھ کیا جائے گا تو وہ میرٹ کے خلاف

ہوگا۔

مزید یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی سماج میں رائج انھی امتیازات کے خاتمے کے لیے انبیا کو بھیجا تھا۔ان کی تعلیم ہی یہ تھی کہ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے۔کل قیامت کی اصل زندگی میں یہی متقی لوگ سب سے زیادہ مقام پائیں گے۔ہاں آج کی امتحان کی دنیا میں کوئی چھوٹا ہے اور کوئی بڑا،کوئی طاقتور ہے کوئی کمزور،کوئی مرد ہے اور کوئی عورت۔لیکن یہ سب امتحان کے لیے ہے نہ کہ خدا کا ابدی فیصلہ۔اس کا ابدی فیصلہ کل قیامت کے دن ظاہر ہوگا اور وہاں وہ عزت پائے گا جو تقوے والا ہوگا۔

امید ہے بات واضح ہوگئی ہوگی۔

والسلام

ابو یحییٰ

ڈاکٹر شہزاد سلیم
محمود مرزا

صدقہ کے لیے بچت

پیسے کی بچت کرنے کا داعیہ ہم انسانوں میں فطری طور پر پایا جاتا ہے۔ کیونکہ مستقبل کی ضروریات کا ادراک ہم عام طور پر پہلے سے ہی کر لیتے ہیں۔ تاہم اس معاملے میں فضول خرچ لوگوں کے لیے یہ ایک عام کہاوت ہے کہ مصیبت کے لیے کچھ بچا رکھو۔

ہم عام طور پر اپنے بچوں کے لیے، یہاں تک کہ اپنی آنے والی مستقبل کی ضروریات کے لیے بھی کچھ نہ کچھ بچا کر رکھتے ہیں۔ ہماری یہی خواہش ہوتی ہے کہ ہمارے بچّے اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔ ان کو زندگی کی تمام سہولیات اور آسائشیں میسر ہوں۔ جو کہ یقیناً ایک قابلِ ستائش جذبہ ہے۔ لیکن ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی ضروریات، خواہشات اور اپنے بچوں سے ماورا بھی دیکھنا سیکھیں اور جس طرح ہم ان کے لیے پیسے جمع کرتے ہیں بالکل اسی طرح نہ صرف معاشرے کے غریب اور ضرورت مند بچوں بلکہ ان کے والدین پر خرچ کرنے کے لیے بھی کچھ پیسے بچا کر رکھیں۔ اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ہم ہر روز ایک مخصوص رقم کسی ڈبہ یا پوٹلی میں رکھتے رہیں تاکہ مہینے کے آخر میں ہمارے پاس بغیر کسی دِقت اور دشواری کے ایک اچھی خاصی رقم جمع ہو جائے۔ یہ رقم جو ہمارے لیے ایک معمولی رقم ہوگی بہت سے لوگوں کی زندگی میں بہت سی خوشیاں لا سکتی ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ اس عمل کو ہم اپنی عادت بنالیں۔ اور اگر اب تک نہیں بنائی تو کیوں نہ آج سے ہی شروعات کی جائے۔

سحر شاہ

ٹائم لائن

''آج کیا کر رہے ہو، علی؟'' امین صاحب نے اپنے دوست کے بیٹے علی کو موبائل فون میں مصروف دیکھ کر سوال کیا۔

''ٹائم پاس''۔ اپنا نام سن کر علی نے ایک لمحے کے لیے سر اٹھا کر انہیں دیکھا اور جواب دے کر دوبارہ گردن جھکا لی۔ امین صاحب پچھلے ایک گھنٹے سے اسے اسی پوزیشن میں دیکھ رہے تھے۔ آج اپنے دوست راشد کے کہنے پر وہ خصوصاً علی کو سمجھانے کے لیے آئے تھے، جس کی زندگی اپنے گردو پیش سے کٹ کر صرف موبائل اور انٹرنیٹ تک محدود رہ گئی تھی۔ جیسے ہی راشد صاحب کمرے سے باہر نکلے، انہوں نے علی سے براہ راست سوال کر دیا تھا۔ اپنی گفتگو کو طول دینے کی غرض سے انہوں نے پھر پوچھا۔ ''وہ کیسے؟''

''بس، ایسے ہی۔۔۔ کوئی مووی، ڈرامہ یا پھر گیم کھیل کر۔۔۔''

''لیکن کیوں؟'' اس سوال پر علی نے انہیں چونک کر دیکھا تو اندازہ ہوا کہ وہ اس وقت صرف اسی سے کیوں مخاطب ہو رہے ہیں۔ پہلے اس نے غور نہیں کیا تھا اور والد کے کمرے سے جانے کا اسے احساس تک نہ ہوا تھا۔ اس نے ایک نظر موبائل پر ڈالی اور پھر اسے جیب میں رکھتے ہوئے بولا ''بوریت محسوس ہو رہی تھی۔ سمجھ نہیں آتا کیا کروں، وقت ہے کہ گزرتا ہی نہیں۔''

''اچھا، اگر مووی، ڈرامہ یا گیم کھیل کر وقت گزارا جائے تو پھر بوریت دور ہو جاتی ہے اور وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوتا؟'' امین صاحب اس کو متوجہ دیکھ کر بڑے دوستانہ لہجے میں مخاطب ہوئے۔

''جی انکل! ایسا ہی ہے۔ بس ٹائم ہی پاس کرنا ہے نا۔۔۔ جیسے دل چاہے، کر لیا۔۔۔ وقت

بچا کر میں نے کون سا آئن اسٹائن بن جانا ہے۔" علی نے آخری جملہ بڑے بے ساختہ انداز میں ہنستے ہوئے ادا کیا۔امین صاحب اس کے والد کے بہت دیرینہ دوست تھے اور وہ تمام بہن بھائی ان سے بے تکلف تھے۔

"بیٹا! کیا آپ کو معلوم ہے کہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے وقت کی قسم کھائی ہے؟" امین صاحب نے اسے وقت گزاری جیسے رویہ پر لیکچر دینے کے بجائے بڑے دلچسپ انداز میں سوال اٹھایا۔

"معلوم نہیں، میں نے قرآن کو ترجمے سے نہیں پڑھا۔بچپن میں ناظرہ پڑھا تھا، اس کے بعد کبھی فرصت ہی نہیں ملی۔" علی نے شرمندہ سے لہجے میں جواب دیا۔

"اچھا۔۔۔ٹھیک ہے تو کیا آپ مجھے یہ بتانا پسند کریں گے کہ آج تک آپ نے ایسا کیا کام کیا ہے جس میں مصروف رہ کر آپ کو فرصت نہیں ملی۔" امین صاحب گفتگو کو ایک خاص رخ پر لانا چاہ رہے تھے۔

"جی، آپ تو جانتے ہی ہیں کہ میں پڑھائی کے سلسلے میں مصروف رہا۔اس کے بعد ڈگری ملی تو اب نوکری کی تلاش میں ہوں۔تقریباً ڈیڑھ سال ہونے کو آیا، کئی جگہ سی وی جمع کروائی، انٹرویوز دیے لیکن تاحال کوئی امید نہیں۔بس اسی پریشانی میں دن رات گزر رہے ہیں۔جب بوریت ہوتی ہے تو ٹائم پاس کے لیے کچھ بھی دیکھ یا سن لیتا ہوں، کبھی گیمز کھیلتا یا پھر دوستوں کے ساتھ گپ شپ کر لیتا ہوں۔" علی نے تفصیلاً جواب دیا۔

"اچھا تو کیا آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی ہر پریشانی دور ہو جائے اور بوریت بھی محسوس نہ ہو؟" امین صاحب نے اس کی بات پر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد پوچھا تو علی بڑے پرجوش انداز میں بولا، "جی ضرور، کون شخص ہوگا جو ایسا نہ چاہے گا۔آپ بتایئے انکل! میں آپ کی ہر

بات پہ عمل کرنے کو تیار ہوں۔''

''بیٹا! سب سے پہلے تو آپ اپنی پچھلی تمام زندگی کا جائزہ لیں۔ کیا کام کرتے رہے، ان کا کیا نتیجہ نکلا۔ زندگی میں اب تک کیا پایا، کیا کھویا۔ اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ آپ کی ٹائم لائن کیا ہے۔'' جواب ملا۔

''ٹائم لائن سے آپ کی کیا مراد ہے؟'' علی نے الجھے ہوئے انداز میں دریافت کیا۔

''ٹائم لائن کا مطلب آپ اس مثال سے سمجھیں کہ آج سے پانچ یا دس سال پہلے آپ کیا تھے اور اس وقت کیا ہیں، آپ میں تب سے لے کر اب تک کیا تبدیلی آئی ہے جو کہ مثبت یا منفی ہو سکتی ہے۔ اُس وقت سے لے کر اب تک کا جتنا بھی آپ کا سفر ہے وہ آپ کی ٹائم لائن ہے۔'' امین صاحب نے بڑے سادہ سے انداز میں وضاحت کی۔

''ٹھیک، لیکن اس ٹائم لائن سے مجھے کیا فائدہ ہوگا۔ جو گزر گیا، اسے بدلا تو نہیں جا سکتا۔'' علی نے بات کو سمجھتے ہوئے اپنا سوال سامنے رکھا۔

''بالکل درست کہا، جو گزر گیا اسے بدلا نہیں جا سکتا۔ یہ وقت ہے، اسے اگر آپ ٹائم پاس کہہ کر لایعنی سرگرمیوں میں گزارتے ہیں تو سمجھ لیں کہ یہ زندگی کی سب سے بڑی غلطی ہے۔ ہم کبھی بھی ٹائم پاس نہیں کرتے بلکہ ٹائم ہمیں پاس کرتا ہے۔ وقت کو گزارا نہیں جاتا، وقت ہمیں گزار کر ہر لمحہ پیچھے کی طرف دھکیل رہا ہوتا ہے۔ اسے آپ لائف پاس کا نام دے سکتے ہیں۔ ہر گزرتا لمحہ ہماری زندگی کو کم کر رہا ہوتا ہے لیکن ہم اس کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں لگا پاتے جب تک کہ ہمیں وقت کی اہمیت کا احساس نہ ہو جائے۔'' امین صاحب نے اسی کی بات کو پوائنٹ بنا کر آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''وقت کی اہمیت کے بارے میں بہت پڑھا سنا ہے۔'' علی نے جواباً کہا۔

''پڑھنے سننے اور اس کا احساس کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے بیٹا! آپ اپنی ٹائم لائن پر غور کرو، ماضی سے اب تک کی ٹائم لائن ۔۔۔اور اس کے بعد مستقبل میں خود کو کہاں دیکھنا چاہتے ہو، اس کی ایک نئی ٹائم لائن بناؤ۔ پھر اس تک پہنچنے کے لیے عملی اقدامات کرو۔ جتنی لگن سے آپ عمل کرو گے، اتنا ہی جلد آپ کو اس کا رزلٹ ملے گا۔'' امین صاحب کا لہجہ ہموار تھا۔

''کیا واقعی یہ سب اتنا آسان ہے؟'' علی بے یقینی کی کیفیت سے دوچار تھا۔

''آسان تب ہوگا جب آپ کو وقت کا مطلب سمجھ میں آئے گا۔ یہ اللہ کی ایک نعمت ہے، ایک خزانہ ہے جو اس نے سب لوگوں کو یکساں طور پر دیا ہے۔ زیادہ تر لوگ اس خزانے کو ضائع کر رہے ہیں لیکن ہمیں جلد ہی اس کا حساب دینا ہوگا۔'' یہ کہہ کر امین صاحب خاموش ہو گئے۔ پھر علی کی دلچسپی کو محسوس کرتے ہوئے بولے۔ ''آپ کو پتہ ہے کہ انسان جب کسی بات پر قسم اٹھاتا ہے تو اپنی کسی عزیز ہستی کے نام کی قسم اٹھاتا ہے۔''

''جی ہاں! انسان کبھی کسی محبوب شخص اور کبھی کسی محبوب شے کی قسم اٹھا کر اپنی بات کا واضح اقرار کرتا ہے، دوسروں کو اس کا یقین دلاتا ہے۔'' علی نے ان کی بات سمجھتے ہوئے جواب دیا۔

''صحیح کہا۔ گرچہ ایک مسلمان کو اللہ سے زیادہ کوئی محبوب نہیں ہونا چاہیے اور قسم بھی صرف اللہ کے نام کی اٹھانا چاہیے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے بھی مختلف چیزوں کی قسم اٹھائی ہے۔ ان میں سے ایک وقت بھی ہے۔'' امین صاحب نے ابتدا میں جس بات کی طرف توجہ دلائی تھی، اسی کو بیان کرتے ہوئے کہا۔ ''سورۃ العصر میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں اور رسولوں کے زمانے (وقت) کی قسم کھا کر ہمیں بتایا ہے کہ بے شک انسان گھاٹے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے، نیک عمل کیے اور دوسروں کو حق اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔''

''آپ کا مطلب یہ ہے کہ ہم مسلمان جو کہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، اس کے رسولوں، کتب،

روز جزا و سزا پر ایمان رکھتے ہیں، کیا ہم بھی گھاٹے میں رہیں گے؟''

''بے شک، اگر ہم ایمان کے ساتھ عمل صالح اختیار نہ کریں گے تو ہم گھاٹا پانے والوں میں شامل ہوں گے اور یہ بات ہمیں خود اللہ تعالیٰ بتا رہے ہیں جن سے بڑھ کر کوئی اپنی بات میں سچا نہیں۔'' امین صاحب نے قطعیت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

''اور یہ گھاٹا کیسا ہوگا؟'' علی بھی عام مسلمانوں کی طرح اسی غلط فہمی کا شکار تھا کہ ایمان لانے کے بعد ہم پر اپنے دین کی طرف سے کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی اور دنیا و آخرت کی کامیابیاں و کامرانیاں صرف مسلمانوں کا مقدر ہیں چاہے وہ بے عملی کا شکار ہی کیوں نہ ہوں۔

''پہلے یہ سمجھو کہ یہ گھاٹا یا نقصان دراصل ہے کیا۔۔۔ گھاٹے یا نقصان سے مراد ہے، وقت پر عمل سے چُوک جانا۔۔ اس دنیاوی زندگی میں ہمیں وقت جیسی عظیم نعمت دی گئی ہے، ایک خاص مدت تک کے لیے مہلت دی گئی ہے، اگر ہم اس عرصے میں اللہ کے فرمان کے مطابق عمل صالح کی راہ نہ اپنائیں گے، نیک اعمال کرنے سے چُوک جائیں گے تو سمجھو ہم گھاٹے میں رہیں گے، دنیا میں اس لیے کہ ہم نے صراط مستقیم کو پہچان کر بھی اس کی طرف قدم نہ بڑھائے، ایک عظیم موقع کو کھو دیا اور آخرت کا گھاٹا تو پھر ابدی ہوگا، کبھی ختم نہ ہونے والا عذاب۔'' یہ کہہ کر امین صاحب خاموش ہو کر علی کی سمت دیکھنے لگے جو گہری سوچ میں مبتلا نظر آ رہا تھا۔ کافی دیر بعد جب وہ بولا تو اس کے چہرے پر ایک نیا عزم تھا،

''آپ کا بہت شکریہ انکل! میں اپنی ٹائم لائن وہی بناؤں گا جس پر عمل کر کے میں دنیا و آخرت دونوں کی فلاح پا سکوں۔ میں نے وقت کی بہت ناقدری کی، اب مزید نہیں۔ میں گھاٹا پانے والوں میں شامل نہیں ہونا چاہتا، اب پہلے قرآن کو سمجھنا ہے جو اللہ کی عنایت کردہ گائیڈ لائن ہے اور عمل کی راہ اپنانی ہے۔ مجھے اپنے رب کا بندہ بن کر زندگی گزارنی ہے۔۔۔۔''

فرح رضوان

عجب چیز ہے لذت آشنائی (سردیاں۔کینیڈا۔مسی ساگا)

الحمدللہ، برفباری ہر روز تا دیر ملی میٹرز میں ہوتی ہے ،گرچہ یہ راستوں سے صاف کی جاتی ہے مگراس کے باوجود جگہ جگہ کئی کئی میٹرز کے ٹیلوں کی شکل اختیار کرتی جارہی ہے۔سڑکوں کی حالت الامان،ٹریفک کی حالت الحفیظ۔

لیکن سلام ہے ان ،تمام مسلمین ومسلمات کوجنہوں نے دشت تو دشت ہے،زیرو وزیبلیٹی ہونے کے باوجوداس بہر بیکراں میں زندگی کا سفر جاری رکھا ہوا ہے۔کہیں کسب حلال کمانے، گھراور دین کے ضروری کاموں ،ہسپتالوں میں مریض، تیماردار یا معالج کے طور پراور کبھی باجماعت نمازوں کی خاطر مساجد جانے کے لیے۔کہیں پبلک سکولوں کی چھٹیوں کے باوجود اسلامی تعلیمات کےحصول کے لیے قائم سمر کیمپس کی جانب محوسفرتو کہیں شادیوں میں شرکت کے لیے جانے کو تیاراور کبھی صرف بچوں کی خوشی،فیملی بانڈنگ یا صلہ رحمی کےتحت رشتہ داروں سے ملنے بچے ،بوڑھے،جوان سبھی اس موسم میں،ان حالات میں بھی بخوشی رواں دواں ہیں۔

کون ہیں یہ لوگ؟

یہ صرف مثبت پہلو دیکھنے والے لوگ ہیں جو چاروں طرف برف دیکھ کرڈپریشن کا شکارنہیں ہوتے۔منفی چالیس درجہ حرارت تک کےموسم میں بھی اس قدرمثبت اور گرمجوش کہ اللہ کی پناہ۔ باتیں سنیں ذراان کی ،فرماتے ہیں،اتنی سخت سردی بھی اللہ کی رحمت ہی ہےاس سے بہت سے جراثیم مرجاتے ہیں اور جب برف پگھلتی ہےتو کتنا وافر پانی ،زمین کوملتا ہے،دریاؤں ،نہروں کو ملتاہے، یہ سب تو اللہ کا احسان ہے۔یہاں سڑکوں کا نظام بہترین ہے، گھروں، گاڑیوں، بسوں،

بازاروں ،دفتروں میں،غرض کہاں ہیٹرنہیں؟ کون سا روز جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لا کرانہیں جلانے کا بار اٹھاتے ہیں؟ اگر کچھ روز برف صاف کرنے کی مزدوری کربھی لیں تو اس کی طاقت بھی اللہ تعالیٰ ہی نے عطا فرمائی ہے...... مسلز درد کریں بے شک لیکن اصل میں مضبوط ہورہے ہوتے ہیں۔

اور برف پر پڑتی چاند کی کرنیں کیسا نور، کیسا اجالا ہر سو بکھرا محسوس ہوتا ہے۔

بہترین موسم ہے نیکیاں کمانے کا، پل صراط کے اندھیرے کے لیے نور جمع کر لینے کا،کسی غریب کے لیے گرم کپڑے، گرم کھانا مہیا کر دیں، کسی سفید پوش کا پتہ تو کریں جو کسی سے لپٹ کر مانگ نہیں پاتا لیکن سردیوں میں ہیٹنگ کا بل ادا کرنا اس کے بس میں بھی نہیں رہتا۔خاموشی سے، کسی بہانے سے اسے کچھ رقم تحفے کے طور پر دے دیں...... پھر دیکھیں کہ ان شاء اللہ ڈپریشن کیسے سر پر پیر رکھ کر بھاگتا ہے۔

اور ساتھ ساتھ برف باری کے ساتھ اللہ کی حمد اور تعریف کریں کہ اسی نے ہم پر یہ سخت موسم آسان فرما دیا۔معصوم بچوں کے ننھے گالوں سے نرم و ملائم برف کے گالے آسمان سے برسیں تو شکر سے مر مٹنے کا مقام ہے اللہ کی رحمت پر کہ کوہ طور کو سروں پر کھڑا کر دینے والے رب کا احسان ہے کہ برف کے پہاڑ ہم پر مسلط نہیں کیے، آسمان کی بلندی سے برف کی سلیں ہمارے ان گنت گناہوں کی پستی کے باوجود نہیں گر رہیں، برستی گولیوں کی مانند اولے نہیں پڑتے رہتے ،آئسکلز (چھری نما آئس) کی صورت آسمان سے برف نہیں گرتی۔اور رہ گئی بات پھسلنے کی تو وہ تو بندہ کیلے کے چھلکے یا چکنے فرش پر بھی پھسل سکتا ہے اور سب سے برا پھسلنا تو کسی گناہ پر کمپیوٹر ماؤس کا یا زبان کا غیبت پر پھسل جانا ہے اس سے بھی اللہ تعالیٰ اپنی پناہ میں رکھے۔

ابو یحییٰ

مضامین قرآن (47)

مطالبات

مضامین قرآن کے سلسلے کے آغاز میں ہم نے یہ بات واضح کی تھی کہ قرآن مجید ہزاروں آیات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب ہے۔ مگر مضامین کے اعتبار سے یہ انتہائی مختصر ہے جس کے بنیادی موضوعات انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ یہ موضوعات نہ صرف تعداد میں بہت کم ہیں بلکہ آپس میں مربوط طریقے سے جڑے ہوئے ہیں۔ ہزاروں آیات پر مشتمل پورا قرآن مجید صرف تین بڑے اور چند درجن ذیلی عنوانات کے تحت نہ صرف مرتب ہو جاتا ہے بلکہ یہ مضامین و عنوانات ہر فرد اور ہر دور کے انسان سے براہ راست متعلق رہتے ہیں۔ یہ بنیادی تین موضوعات درج ذیل ہیں۔

۱) دعوت دین اور اس کے رد و قبول کے نتائج

۲) دعوت کے دلائل

۳) مطالبات

ہم ابتدائی دو موضوعات یعنی دعوت دین اور اس کے رد و قبول کے نتائج اور دعوت کے دلائل پر بہت تفصیل کے ساتھ گفتگو کر کے یہ جائزہ لے چکے ہیں کہ ان کے ذیل میں قرآن مجید نے کیا کچھ بیان کیا ہے۔ انشاء اللہ آج سے ہم اس سلسلے کے آخری موضوع یعنی مطالبات پر گفتگو کا سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔

تزکیہ نفس اصل اور بنیادی مطالبہ

قرآن مجید میں بیان ہونے والے مطالبات اس اعتبار سے بہت اہم ہیں کہ یہی وہ کسوٹی ہیں جن کی بنیاد پر ہمیں اپنی شخصیت کو پرکھنا ہوتا ہے اور یہی وہ معیارات ہیں جن کے مطابق ہمیں اپنی شخصیت کو ڈھالنا ہوتا ہے۔ اور آخر کار یہی وہ پیمانہ بنیں گے جن پر تول کر روز قیامت ہمارا وزن ہوگا اور اسی وزن کی بنیاد پر ہمارے ابدی مستقبل کا فیصلہ ہوگا۔ قرآن مجید کے یہ مطالبات نجات کے اس مرکزی خیال سے پھوٹتے ہیں جسے بلاشبہ دین کا نصب العین کہا جاسکتا ہے۔ یعنی تزکیہ نفس جس پر آخرت کی فلاح موقوف ہے۔ قرآن مجید نے متعدد مقامات پر یہ بات بالکل کھول کر واضح کی ہے کہ جنت کی فلاح اور کامیابی کا انحصار نفس انسانی کے تزکیے یا پاکیزگی پر ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

> ''قسم ہے نفس انسانی کی اور جیسا کہ اسے ٹھیک بنایا۔ پھر اس کی بدی اور تقویٰ اسے الہام کیا، کامیاب ہوا وہ جس نے اس نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا جس نے اسے آلودہ کر دیا۔''
> (الشمس 91: 10-7)

جنت کی فلاح کا تزکیے پر منحصر ہونے کی یہی بات قرآن مجید کے دیگر مقامات پر مثلاً سورہ طٰہٰ 20:76-75، سورہ اعلیٰ 87:14 وغیرہ سے بھی واضح ہے۔ جبکہ قرآن مجید میں چار مقامات پر اسی تزکیہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی تمام تعلیم کا اصل مقصد بتایا گیا ہے۔ سورہ جمعہ کی آیت درج ذیل ہے۔

> وہی ذات ہے جس نے ان امیوں میں سے ایک رسول انھی میں سے اٹھایا ہے جو اس کی آیتیں ان پر تلاوت کرتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور (اس کے لیے) انھیں قانون اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، (الجمعہ 62:2)

چنانچہ تزکیہ نفس اس پورے دین کا اصل مقصد ہے جسے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

تشریف لائے اور جو قرآن وسنت کی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔تاہم اس کتاب میں ہمارے پیش نظر صرف قرآن مجید کے مضامین کا احاطہ کرنا ہے، اس لیے ہم سنت سے صرف نظر کرتے ہوئے قرآن مجید میں بیان کردہ مطالبات تک خود کو محدود رکھیں گے۔ان مطالبات کو ہم تین ذیلی عنوانات کے تحت بیان کر سکتے ہیں۔

۱) اخلاقی مطالبات

اخلاقی مطالبات کا اصل ماخذ فطرت انسانی ہے۔قرآن مجید نے فطرت کی اس آواز کو متعین اوامر ونواہی کی شکل میں تین پہلوؤں سے بیان کر دیا ہے۔

الف)اللہ تعالیٰ کے حوالے سے عائد کردہ مطالبات

ب)سماج اور اس کے مختلف طبقات کے حوالے سے عائد کردہ ذمہ داریاں

ج)نوع انسانی کے دو بنیادی اجزا یعنی مرد وزن کے باہمی معاملات کے لحاظ سے عائد مطالبات

۲) شرعی یا قانونی مطالبات

یہ وہ مطالبات ہیں جن میں باقاعدہ قانون سازی کرکے ان میں وقت، دن، تعداد اور دیگر شرائط متعین کرکے ان کو قابل عمل ضابطوں کی شکل میں ڈھال دیا گیا ہے۔ان کی دو ذیلی قسمیں ہیں۔

۱)فرد پر عائد شرعی ذمہ داریاں

۲)سماج اور ریاست پر عائد قانونی ذمہ داریاں

۳) شخصی رویے

ہم نے پیچھے بیان کیا کہ دین کا نصب العین تزکیہ نفس یعنی اپنی شخصیت کو پاکیزہ بنانے کا عمل

ہے۔انسانی نفسیات کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ بہت سے رویے انسانی نفسیات کی تشکیل میں اس طرح حصہ لیتے ہیں کہ ان کی سمت درست نہ کی جائے تو وہ ہر طرح کا اخلاقی اور قانونی فساد برپا کرنے کا سبب بن جاتے ہیں۔معاملہ برعکس ہو تو شخصیت ایمان واخلاق کی دعوت کو قبول کرنے اور اسے زندگی بنانے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ یہ رویے قرآن مجید میں کئی مقامات پر بالواسطہ طور پر زیر بحث آگئے ہیں۔ہم انشاءاللہ ان کو نمایاں کر کے قارئین کے سامنے رکھیں گے تا کہ وہ اس پہلو سے قرآن کے مطلوب اور نامطلوب رویوں سے واقف ہو سکیں۔

اخلاقی مطالبات

انسانی شخصیت تین بنیادی چیزوں سے مرکب ہے۔ایک سب سے زیادہ نمایاں اور بظاہر اس کی پہچان بننے والا اس کا حیوانی جسم ہے۔یہی وہ قالب ہے جو اس دنیا میں کسی انسان کی شناخت بنتا ہے۔انسان کا یہ حیوانی قالب کئی پہلوؤں سے دیگر جانوروں سے ممتاز ہے، مگر تنہا اسی کے بل بوتے پر انسان آج کرہ ارض پر حکومت نہیں کر رہا۔ یہ انسان کے اندر موجود عقل وفہم کی صلاحیت ہے جس کی بنا پر انسان دیگر مخلوقات کے مقابلے میں بہت آگے نکل گیا ہے۔عقل وفہم کی یہ صلاحیت ہی انسانیت کا شرف ہے اور اگر کبھی کسی حادثے میں یہ صلاحیت سلب ہو جائے تو انسان دو قدموں پر چلنے والے جانور کے سوا کچھ اور نہیں رہتا۔

تاہم انسان کی شخصیت کا ایک مزید پہلو ایسا ہے جس کے بغیر انسان مکمل نہیں ہوتا۔ یہ پہلو انسان کے اندر پایا جانے والا خیر وشر کا ایک واضح تصور ہے جسے ہم انسان کا اخلاقی وجود کہتے ہیں۔ خیر وشر کا یہی شعور ہے جو مادی وجود کے تقاضوں سے انسان کو بلند کرتا ہے۔ یہ انسان کی جبلتوں پر پہرے بٹھاتا ہے۔ یہ انسان کی مادی طاقت کے سامنے اخلاق کی دیوار کھڑی کرتا ہے۔ یہ انسان کی عقل اور جذبات کو ایک حد میں رکھتا ہے۔

خیر وشر کا یہ اخلاقی شعور جو طاقت، مادیت، حیوانیت، جبلت سے بلند اور عقل پر حاکم ہے انسان نے اپنے پروردگار سے پایا ہے۔ یہ انسان کے اس روحانی پیکج کا حصہ ہے جو وہ اپنی تخلیق کے وقت نفخ روح (ص 38:72-71، الحجر 29:15، السجدہ 9:32) کے نتیجے میں اس دنیا میں لے کر آیا تھا۔ سورہ الشّمس میں اس بات کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

”قسم ہے نفس انسانی کی اور جیسا کہ اسے ٹھیک بنایا۔ پھر اس کی بدی اور تقویٰ اسے الہام کیا، کامیاب ہوا وہ جس نے اس نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا جس نے اسے آلودہ کردیا۔“، (الشّمس 91: 10-7)

چنانچہ انسانی فطرت جس طرح خوشبو اور بدبو میں فرق کرنے میں دھوکا نہیں کھاتی اسی طرح اخلاقی خیر وشر مثلاً سچ اور جھوٹ، ظلم وعدل، امانت اور خیانت میں بھی اطمینان سے فرق کرکے ایک کو پسند اور دوسرے کو ناپسند کرتی ہے۔ کوئی شخص اپنی طاقت، مفاد، خواہش یا فطرت کی کجی کے باعث کبھی ان حقائق کو جھٹلانے کی کوشش بھی کرے تو جیسے ہی اس کے ساتھ اخلاقی طور پر غلط معاملہ ہوگا وہ فوراً پکار اٹھے گا کہ یہ غلط ہے۔ یہ فطرت کا اتنا واضح راستہ ہے کہ قرآن مجید نے بلا تکلف اسے راستے (الدہر 3:76، البلد 10:90) سے تعبیر کیا۔ فطرت کی اس سیدھی راہ سے کبھی کوئی شخص ہٹنا چاہے تو خود اس کا نفس اسے ملامت کرتا ہے (القیامۃ 2:75)۔

تاہم چونکہ اس کا امکان ہے کہ فطرت کا یہ الہام وقت، زمانے اور حالات کی گرد میں کبھی دب جائے اور اپنی روشنی گُم کردے یا کم کر بیٹھے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں انبیا کو اسی فطری الہام کی یاددہانی کی غرض سے بھیجا ہے۔ انبیا علیھم السلام انسان کو اسی اخلاقی شعور کی بنیاد پر اس کے تنہا خالق کی طرف بلاتے ہیں۔ اسی کی بنیاد پر دوسرے انسانوں کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین اور اعلیٰ اخلاقی رویوں کی تلقین کرتے ہیں اور اسی کی بنیاد پر فواحش و بدکاری کے بجائے عصمت

وپاکدامنی کی راہ کی طرف بلاتے ہیں۔ چنانچہ یہ ایک جنگ ہے جس میں ایک طرف شیطان اور انسان کا نفس حیوانی اسے اخلاقی حدود پامال کر کے صرف جبلت اور خواہش کے راستوں پر بلا رہے ہوتے ہیں اور دوسری طرف انبیا علیھم السلام اور انسانی ضمیر اسے درست اخلاقی رویے کی تلقین کرتے ہیں۔ ایسے میں انسان کو خود یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ وہ کس راہ پر چلتا ہے۔ صحیح وغلط کے امتیاز کی کسوٹی اللہ نے خود اس کے اندر دے دی ہے جس کی بنیاد پر وہ اپنے حتمی رویے کا فیصلہ کرتا ہے اور اسی کی سزا و جزا وہ قیامت کے دن پائے گا۔

اخلاقیات کے ضمن کی آخری اصولی بات یہ ہے کہ اس کا اصل ماخذ خدا کی اپنی ہستی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ہستی ایک طرف ساری طاقت اور قوت کی مالک ہے اور دوسری طرف وہ سرتاسر عدل و رحمت ہے۔ اسی عدل و رحمت کی بنیاد پر وہ اپنی مخلوق کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں۔ اسی عدل و رحمت کا ایک اثر انہوں نے انسانوں کی تخلیق کے وقت ان میں رکھ دیا تھا۔ جو لوگ اس سرمائے کی مادی دنیا کی آلائشوں سے حفاظت کر کے بلکہ دنیا کے امتحان میں اسے بڑھا کر خدا کے حضور لوٹتے ہیں، ان پر اللہ کا فضل ہوگا۔ دوسری صورت میں جہنم ایسے لوگوں کا ٹھکانا ہوگی۔

پروین سلطانہ حناؔ

غزل

مٹادی اپنی ہستی ہم اسے ایثار کہتے ہیں
جسے تم پھول سمجھے ہو، اسے ہم خار کہتے ہیں

وہ شاعر ہیں، مغنّی ہیں، دلوں میں درد رکھتے ہیں
گلُوں پر شبنمی قطروں کو جو رخسار کہتے ہیں

تمہیں تائیدِ الفت کی اگر اب بھی ضرورت ہے
محبت ہے ہمیں تم سے، چلو سو بار کہتے ہیں

کسی سے کہنے سننے سے تو رنجش اور بڑھتی ہے
گزرتی ہے جو اس دل پر حضورِ یار کہتے ہیں

کہ اپنی اپنی سوچوں کا یہی تو فرق ہوتا ہے
جسے تم جیت کہتے ہو، اسے ہم ہار کہتے ہیں

تمہارے، روئے تاباں سے نظر ہٹتی نہیں میری
محبت بدگماں ہے اس لئے ہر بار کہتے ہیں

عوام النّاس کے غم سے انھیں کیا فرق پڑتا ہے
جو بے حس ہیں زمانے میں انھیں سرکار کہتے ہیں

کسی کی جان جائے اور ان پر آنچ نہ آئے
زمانے کے یہ سوداگر اسے بیوپار کہتے ہیں

اگر چہ ہاتھ خالی ہیں، مگر دِل تو غنی ہے نا
اسی کو اہلِ ایماں اپنا بیڑا پار کہتے ہیں

صلہ پاتے وہی ہیں جو یہاں ہیں حوصلے والے
کہ اپنی آبلہ پائی کو بھی گلزار کہتے ہیں

قبیلے والے لوگوں کا الگ اپنا ہی شجرہ ہے
محمد مصطفیٰ ﷺ کو اپنا ہم سردار کہتے ہیں

حناؔ روحانی قدروں پر بڑا ایمان رکھتی ہے
مگر دنیا کے متوالے، انھیں بیکار کہتے ہیں

Please visit this link to read the articles and books of Abu Yahya online for free.

www.inzaar.org

To get Abu Yahya Quotes Join us on twitter:

Twitter ID: @AbuYahya_inzaar

To read Abu Yahya articles regularly Join us on Facebook

Abu Yahya Page: www.facebook.com/abuyahya.inzaar

Abu Yahya Account: www.facebook.com/abuyahya.jzsh

Join us on Youtube

Search inzaar on YouTube to see our audios and lectures

To get monthly books, CDs/USB and Inzaar's monthly magazines at home anywhere in Paksitan, contact # 0332-3051201 or 0345-8206011

To participate in online courses, visit

www.inzaar.org/online-courses/

To get any other information, email to globalinzaar1@gmail.com

Following material in audio form is available on USB/CD:

Quran Course by Abu Yahya

Quran Translation and Summary by Abu Yahya

Islahi Articles

Jab Zindagi Shuru Hogi (book)

Qasam Us Waqt Ki (book)

Aakhri Jang (book)

Monthly
INZAAR
MAR 2018
Vol. 06, No. 03
Regd. No. MC-1380
Publisher: Rehan Ahmed Printers: The Sami Sons Printers,
25-Ibrahim Mansion, Mill Street, Pakistan Chowk, Karachi